

# فلمی قائدہ



کرشن چندر





# فلمی قاعدہ

ناول،

# فلمی قاعدہ

(ایک طنزیہ)

کرشن چندر

ایشیا پبلشرز ۵ بھارگو لین، بیس ہزاری دلی

آرٹسٹ :-  
کتابت :-  
مطبوعہ :-  
ایس دیوان  
اعجاز نبی  
یونین پرنٹنگ پریس دہلی

قیمت

چار روپے  
تعداد :-  
تاریخ :-  
پچاس پیسے  
ایک ہزار  
فروری ۱۹۶۶ء

پبلشر

کمالا چوہدری



عجیب زمانہ آن لگا ہے۔ آجکل بچے پیدا ہو کر ڈیڑی بعد میں کہتے ہیں۔ دلہن پکڑ کر کہنا پہلے سیکھ جاتے ہیں۔ ماں کا شبہ زبان پر بعد میں آتا ہے۔ دنیا گماری سب سے پہلے آ جاتا ہے۔ اور بہت آسانی سے؛ جو حال گھر کا ہے۔ وہی اسکول کا ہے۔ ایک دفعہ مجھے اسکول میں پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے پوچھا۔ "بچو! تباؤ راماؤ کسے لکھی؟" جواب ملا۔ "بابو بھائی مستری نے!" میں نے پوچھا۔ "مشہور منسل بادشاہوں کے نام گناؤ۔" بولے، "مغل اعظم۔ بابر۔ شاہجہاں۔ پکار۔ اور کے آصف!" میں نے پوچھا۔ "بہئی کا خیرا؟" بیان کرو۔" بولے، "بہئی کے مشرق میں چیمپور ہے جہاں راجپور

رہتا ہے۔ شمال میں پانی ہل ہے جہاں دلیپ رہتا ہے۔ مغرب میں  
و جنتی مالا کا مکان ہے اور جنوب میں جے مشرقی کا!۔ میں نے  
اسی دن اسکول سے استعفیٰ دیدیا اور گھر چلا آیا۔

گھر آکر بہت سوچا۔ بہت سوچا۔ آخر سمجھ میں آیا۔ کہ  
غلطی میری ہے۔ دراصل یہ فلم کا عہد ہے۔ ہندوستان میں صرف  
نپدرہ فی صدی لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ لیکن سینما دیکھنے والے سو فیصدی  
ہیں۔ اس لئے اگر لوگوں کو پڑھے لکھے بنانا ہے تو اس کا سب سے  
آسان طریقہ یہ ہے کہ انہیں فلم کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے۔ یہی سوچ  
کر میں نے مندرجہ ذیل فلمی قاعدہ لکھا ہے۔ میسرادعویٰ ہے کہ اس کے  
پڑھنے سے ہر وہ شخص جو پڑھا لکھا نہیں ہے۔ بہت جلد پڑھنا لکھنا  
سیکھ سکتا ہے۔ اپنے دلش اور اپنے ماں باپ کا نام روشن کر سکتا ہے۔  
اس قاعدے کی فلم بھی بن سکتی ہے۔ بلکہ اس کے ایک ایک حرف  
کی فلم بن سکتی ہے۔ جو پروڈیوسر چاہے مصنف کی اجازت حاصل  
کئے بغیر اس کی فلم بنا سکتا ہے۔ اور اس کے اندر ناچ اور  
گانے اپنی حیثیت اور حماقت کے مطابق ڈال سکتا ہے۔ !



لیجئے اب شروع کرتا ہوں۔

ولف سے اندھیرا ہوتا ہے۔ جو فلم انڈسٹری کے لئے بے حد ضروری ہوتا ہے۔ دنیا کا ہر کام دن کی روشنی میں ہوتا ہے۔ اسکول دن میں کھلتے ہیں، کارخانے دن میں چلتے ہیں۔ دفتر دن میں کھلتے ہیں۔ لیکن فلم کا ہر کام اندھیرے میں ہوتا ہے۔ فلم اندھیرے میں بنائی جاتی ہے۔ اندھیرے میں دھوئی جاتی ہے۔ اور اندھیرے میں دکھائی جاتی ہے۔ اس انڈسٹری میں شروع سے آخر تک اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اس لئے اس انڈسٹری میں کامیاب ہونے کے لئے عقل کا اندھا اور گمانہٹ کا پورا ہوتا ہے حد ضروری ہے۔

تو پیارے بچو! جلدی سے اپنی آنکھیں بند کرو اور زور سے

کہو۔

ولف سے اندھیرا۔

ولف سے آئینہ ہوتا ہے۔ جو ہر فلم کی جان ہوتا ہے۔ فلم کیمرے میں چلتی ہے۔ جو ایک طرح کا آئینہ ہوتا ہے۔ میروین آئینے میں اپنی صورت دیکھتی ہے۔ اور میک اپ کے ذریعہ اپنی بد صورتی چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ پر ویکسٹر بھی ایک طرح کا آئینہ ہی ہوتا ہے۔

جس میں سے روشنی گزار کر فلم پر دے پڑھنیکی جاتی ہے۔ پروڈیوسر دراصل ایک طرح کا آئینہ ساز ہوتا ہے جو لاکھوں روپے خرچ کر کے آپ کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کامیاب ہو گیا تو لاکھوں کے وارے بنارے کہہ لیتا ہے ورنہ سر جھکا کر کہتا ہے۔

”آئینہ دیکھ اپنا سامنہ لے کے رہ گئے!“

اس لئے بچو، تنگ موری کی پستلون پہنو، لال رنگ کی ٹش مٹرٹ بالوں کو ماتھے پر گرا لو اور آئینہ دیکھ کر کہو۔

”لطف سے آئینہ۔“

لطف سے انٹرویو بھی ہوتا ہے۔ جو ہر فلم کمپنی میں ہوتا ہے۔ انٹرویو کئے بغیر فلم انڈسٹری میں کام کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن یہ انٹرویو، دوسری جگہوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ دوسری جگہوں پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کی عقل کیسی ہے۔ یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کی شکل کیسی ہے۔ دوسری جگہوں پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ نے کالج کے کتنے امتحان پاس کئے ہیں۔ یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کتنے امتحانوں میں فیل ہوئے ہیں۔ اور جو آدمی جتنا زیادہ فیل ہو چکا ہوگا۔ اتنا ہی فلم انڈسٹری میں زیادہ کامیاب ہوگا۔



اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لڑکا اسکول یا کالج میں فیمل ہوتا ہے۔  
 فوراً گھر سے بھاگ کر کسی فلم کمپنی میں انٹرویو کرنے کے لئے بیسی کا رخ  
 کرتا ہے۔ اس لئے بچو تم بھی جلدی سے اپنی کتابیں پھاڑو، سامان باندھو  
 اور بولو۔

”لطف سے انٹرویو۔“

لطف سے ایچکدانہ ہوتا ہے جو ہمیشہ بیچکدانہ کے ساتھ  
 نگار رہتا ہے۔ جیسے شکر کے ساتھ جے کشن۔ انہم نے مہاتما گاندھی کا  
 نام نہیں سنا ہوگا۔ لیکن وہ مشہور گیت فرورسنا ہوگا۔ ایچکدانہ  
 بیچکدانہ والے اوپر دانہ؟ یہ ایک مشہور فلمی گیت ہے جسے بعض  
 ہونہار بچے بندے مائیم کی جگہ گاتے ہیں اور اسکول کی سالانہ  
 نمائش میں انعام پاتے ہیں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ یہ کوئی بچہ  
 مجھے آج تک نہیں سمجھا سکا۔ لیکن اس میں بچوں کا کوئی قصور  
 نہیں ہے۔ دراصل یہ دنیا اتنی ترقی کر گئی ہے اور اس دنیا  
 کے ساتھ ساتھ علم اور سائنس اتنی ترقی کر چکے ہیں کہ ہر بات  
 کا جاننا بہت مشکل ہے۔ آپ کسی بچے سے پوچھئے کہ اس نے  
 کلاس میں کتنے نمبر حاصل کئے؟ بڑی مشکل سے بتائے گا لیکن

دلیپ کمار کا نمبر پوچھیے۔ فوراً بتا دیگا! — اس لئے بچو اگر فلم میں کام کرنا چاہتے ہو تو کسی بات کا مطلب جانتے کی کوشش مت کرو۔ جلدی سے سر ہلا کے کہو۔ ”الف سے ایچکدا نہ!“

الف سے ایمانداری بھی ہوتی ہے۔ جو آجکل کی دنیا میں عرف بلیک کے بھاؤ سے ملتی ہے۔ اسی لئے میں نے ایمانداری کا نام نہیں لیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایمانداری کوئی ہیرو تو ہے نہیں۔ وہ کوئی ہیروئن بھی نہیں ہے۔ جسے فلم کے پردے پر دکھایا جاسکے۔ اور آجکل کے بچوں کا یہ دستور ہے کہ جس چیز کو وہ فلم پر نہیں دیکھ سکتے اسے سمجھنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ آجکل کے زمانے میں ایمانداری ایک بے مطلب بے معنی نہ سمجھ میں آنے والی شے ہے۔ یعنی جو ایمانداری ہے وہ گویا ایک طرح کا ایچکدا نہ ہی ہے۔ اس لئے بچو ایمانداری کو بھول جاؤ اور زور سے کہو۔

”الف سے ایچکدا نہ!“

الف سے اُدھار ہوتا ہے جس پر اکثر فلم کمپنیوں کا دار و مدار ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک فلم کمپنی صرف تین چیزوں کے سہارے پر



چلتی ہے۔ سنگھار۔ اشتہار اور ادھار — ان میں سب سے زیادہ  
 ضروری چیز ادھار ہے — لوگ کہتے ہیں کہ ادھار محبت کی قینچی  
 ہے۔ مگر وہ فلم کمپنی کی جان ہے۔ اگر کہیں سے ادھار نہ ملے تو دو تہائی  
 فلم کمپنیوں کی جان نکل جائے۔ اگر شوٹنگ کے وقت کپڑے والا  
 کپڑے ادھار نہ دے تو اکثر ایکٹر لوگ سیٹ پر چڑھی پہنے گھومتے  
 نظر آئیں۔ اگر کینٹین کھانا ادھار پر نہ دے تو سارا اسٹاف بھوکا  
 مرجائے۔ اگر اسٹوڈیو والا اسٹوڈیو ادھار نہ دے تو اسی وقت  
 پیک اپ ہو جائے — یہاں کہانی ادھار پر آتی ہے۔ ہیروین ادھار  
 پر آتی ہے۔ سیٹ ادھار پر بنایا جاتا ہے۔ فرنیچر ادھار پر سجایا  
 جاتا ہے۔ ہیئر ڈریسر ادھار پر ملتی ہے۔ کیمیرے کی ہر ریل ادھار پر چلتی  
 ہے۔ ہیرو کا گھوڑا — دلہن کا کوڑا، ارجن کا رتھ، سونے کا مٹھ  
 گالوں کی لہلی۔ کانوں کی بالی۔ دلہن کا صندوق، سپاہی کی بندوق۔  
 مرغی کا انڈا۔ سادھو کا ڈنڈا — سب کچھ ادھار پر ملتا ہے —  
 گویا فلم کمپنی کی جو بہار ہے خالص ادھار ہے۔! آپ نے وہ محاورہ  
 تو ضرور سنا ہوگا۔ "ادھار کھائے بیٹھے ہیں" یہ ضرور کسی فلم کمپنی میں  
 کام کرنے والوں کی صورتوں کو دیکھ کر بنایا گیا ہے۔ اس لئے بچو اگر  
 فلم پر ڈیو سرنہ بنا چاہتے ہو تو ابھی سے ادھار مانگنا شروع کرو —

اور بولو —

”لوف سے ادھار۔!“

”لوف سے اوٹ پٹانگ!“

عام طور پر اوٹ پٹانگ کسی ایسی بات کو کہتے ہیں جس کا کوئی سر پیر نہ ہو۔ جو بالکل بے معنی، بے کار اور مبہل ہو۔ مگر فلم انڈسٹری میں اس کا مطلب ہے کہانی !

باقی ہر بات کا فلمی دنیا میں کوئی نہ کوئی مطلب ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی اصول ہوتا ہے۔ اس کے استعمال کرنے کا کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کیمیرے کا فلٹر استعمال کرنے کا ایک اصول ہے۔ گھوڑے کو دوڑانے کا ایک طریقہ ہے۔ کیمیرے کے ساتھ مائک کو استعمال کرنے کا ایک مطلب ہے۔ لیکن فلمی کہانی کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے۔ نہ طریقہ ہوتا ہے۔ اکثر حالتوں میں اس کا مطلب بھی نہیں ہوتا۔ سو راجیہ حاصل ہونے کے بعد اگر مکمل آزادی کسی کو ملی ہے تو صرف فلمی کہانی کو۔ لیکن اس میں قصور نہ کہانی لکھنے والے کا ہے۔ نہ کہانی



فلمانے والوں کا — بلکہ دیکھنے والوں کا جن کو صرف اوٹ پٹانگ  
 کہا بنیاں پسند آتی ہیں — یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو کہانی جتنی زیادہ  
 اوٹ پٹانگ ہوگی اتنی ہی زیادہ لوگوں میں مقبول ہوگی۔ اگر ہیرہ  
 قاعدے اور مشرافت سے محبت کرے تو کس کو پسند آتی ہے؟ لیکن  
 اگر وہ ہیرہ دین کو کمر سے پکڑ کر دو چکریاں دیکر اپنے سر پر اٹھا کر باہر  
 گلی میں نکل آئے اور سڑکوں پر گیت گاتا چلے تو واہ، واہ کے دو نگرے  
 برس جاتے ہیں اور لوگ سینما کے باہر کیو پر کیو رگائے لگتے ہیں۔  
 مجھے خود ایسی اوٹ پٹانگ کہانیاں بہت پسند آتی ہیں۔ جن کا  
 کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ لیکن جو بڑے مزے میں ہنساتی اور رلاتی  
 جاتی ہیں۔ کیونکہ اندر سے میں بھی ایک بچہ ہوں۔ چھوٹا سا —  
 تمہاری طرح۔ اس لئے آؤ بچو، اوٹ پٹانگ تصویریں دیکھیں اور  
 کہیں —

”لف سے اوٹ پٹانگ!“

”لف سے اُن ہوتی۔“

لف سے ان ہوتی ہوتی ہے — اُن ہوتی کا فلم سے

بڑا گہرا تعلق ہے۔ ان ہونی وہ ہوتی ہے جو فلم کے سوا اور کہیں نہیں  
 ہوتی ہے۔ ایسی کہانی جو زندگی میں کہیں نہ دکھائی دے۔ اپنے دلیس  
 جو لوگ کبھی نہیں مہنتے۔ ایسے مکان جو فلم کے سوا اور کہیں نہیں  
 پائے جاتے۔ ایسے ناچ جو اور کہیں نہیں ناچتے جاتے۔ ایسے  
 سپاہی جو ایک تلوار سے ساری فوج کو کاٹ کے پھینک دیتے ہیں۔  
 یہ اور ایسی دوسری ان ہونی باتیں آپ صرف فلم میں دیکھ سکتے ہیں۔  
 اور لوگ دراصل اسی لئے فلم دیکھنے جاتے ہیں کیونکہ جو ہوتی ہے۔  
 یا ہو سکتی ہے۔ اسے دیکھنے کی کسے چاہ ہے۔ اسی لئے ہر اچھی فلم  
 ان ہونی سے شروع ہوتی ہے۔ اور ان ہونی پر ختم ہو جاتی ہے۔  
 یہ ان ہونی وہ سندسپا ہے۔ جو ہر شخص اپنے دل میں چھپائے  
 گھومتا ہے۔ اور جب وہ صرف فلم کے پردے پر دیکھتا ہے۔ اس  
 لئے ان ہونی کو یاد رکھو۔ اور کہو۔  
 "الف سے ان ہونی۔"



## فلمی قاعدہ

### ”لف سے اکیسٹرا“

لف سے اکیسٹرا ہوتا ہے۔ اور ہوتی بھی ہے۔ یعنی اکیسٹرا مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی۔ فلم میں جب کسی گلی محلے یا بازار کا سین دکھایا جاتا ہے۔ تو اس میں چلنے پھرنے والے لوگوں کی اکثریت اکیسٹرا ہوتی ہے۔ وہ پان بیچنے والا اکیسٹرا ہے۔ اور وہ جو دکان پر کھڑا ہو کر ”ایک پونا کا لاکا ٹڈی“ پان کی فرمائش کر رہا ہے وہ بھی اکیسٹرا ہے۔ بادشاہ کے درباری اکیسٹرا ہوتے ہیں۔ وہ وہ دربان جو لال رنگ کا چونا پہنے شہرے رنگ کی موٹھ والی چھتری ہاتھ میں لئے بادشاہ کے آگے چل رہا ہے۔ اور بلند بانگ لہجہ میں



چلا رہا ہے۔ "باادب با ملاحظہ ہوشیار"۔ وہ بھی ایکسٹرا ہے۔۔۔  
 کبھی کبھی بادشاہ بھی ایکسٹرا ہوتے ہیں۔ جیسے وہ آجکل اکثر ملکوں  
 میں ہوتے ہیں۔ یعنی سنہری وردی پہنے تخت پر بیٹھے ہیں۔ مگر مجال  
 نہیں کہ انہی مرضی سے اپنے جوتے کا لٹمہ بھی کھول سکیں۔

مجھے آجکل کے بادشاہوں اور فلم کے ایکسٹرا لوگوں کو دیکھ  
 کر بڑی ہمدردی ہوتی ہے۔۔۔ مگر دراصل یہ لوگ کسی ہمدردی کے  
 محتاج نہیں ہیں۔! فلم کے ایکسٹرا فلمی دنیا میں سب سے کم کماتے  
 ہیں۔۔۔ مہینے میں کسی کو پانچ دن تو کسی کو دس دن کام ملتا ہے۔۔۔  
 باقی دن یہ مانگے مانگے سے کس طرح چلاتے ہیں۔ سبھگو ان ہی بہتر  
 جانتا ہے۔۔۔ مگر پھر بھی یہ فلمی دنیا سے الگ نہیں ہو سکتے۔۔۔  
 کسی قیمت پر الگ نہیں ہو سکتے۔ اگر یقین نہ آئے تو کسی فلمی ایکسٹرا  
 کو جو مہینے میں بڑی مشکل سے پچیس روپے کماتا ہے۔۔۔ پچاس  
 روپے کی دربانی پیش کر کے دیکھ لیجئے۔ وہ ٹھوکر مار دیگا۔ کام  
 کو بھی اور آپ کو بھی۔۔۔ اسے فلمی دنیا میں پانچ دن کام کر کے باقی  
 پچیس دن بھوکا مرنا منظور ہے۔ مگر وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتا۔  
 دراصل یہ ایکسٹرا وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہیر و یا ہیر دین  
 بننے کی خواہش میں ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھر چھوڑ کر اپنے ماں

باپ، بھائی بہن، خاوند بیوی بچے سب چھوڑ کر بیٹی چلے آتے ہیں اور  
بھیڑوں کی طرح ایک سیٹ سے دوسرے سیٹ پر دھکیلے جاتے  
ہیں۔ ان میں سے ہر مرد یا عورت کی آنکھوں میں ایک خواب بستا ہے۔  
کبھی وہ ہیروین بن جائیں گے۔ اور بد قسمتی سے فلمی دنیا میں چند  
ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کبھی ایک ایکسٹرا دو سال تک ایکسٹرا رہا۔  
پھر اچانک ہیرو بن گیا۔ ایک لڑکی جو پانچ سال تک ایکسٹرا رہی  
اچانک ہیروین بن گئی۔ اور آمپارہ میں بیٹھ گئی۔ اس لئے یہ خواب کسی  
ایکسٹرا کی آنکھوں سے نہیں سٹایا جاسکتا۔ !

میں اپنے ایک فلمی ایکسٹرا دوست کو جانتا ہوں۔ آج

سے دس سال پہلے وہ انہی دوسو کی ملازمت چھوڑ کر بیٹی میں ہیسرو  
بننے کے لئے آیا تھا۔ اس کی شکل تو اود بلاؤ ایسی ہے۔ گریبال  
دلیپ کمار ایسے دکتا ہے اور اس لئے اپنے آپ کو کسی طرح دلیپ کمار  
سے کم نہیں سمجھتا۔ فلمی دنیا میں آتے ہی اسے جو پہلا کام ملا۔ وہ  
لاٹھی اٹھا کر ایک ٹھاکر کے پیچھے چلنے کا تھا۔ دس سال بعد آج بھی وہ  
اسی طرح لاٹھی اٹھا کر اسٹوڈیو کے دروازے پر کھڑا نظر آتا ہے۔ مگر  
فلمی دنیا سے باہر نہیں جائے گا۔

فلم کا ایکسٹرا آج کی دنیا کا ڈان کو لیکٹو Don quixote

ہے۔ وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے اور اپنی چاہت کا نیرہ ہاتھ  
میں لئے کسی جھپکتی ہوئی ہوا پکی کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اسے اس کے خوابوں  
میں گرفتار رہتے دو۔ اور سبق سیکھو کہ۔  
”لف سے ایکسٹرا۔“

”لف سے ایکسٹرا۔“

بھٹی میں دسوار سے آتا ہے۔ پنجاب سے آتا ہے۔ اور یوپی  
سے آتا ہے۔ اور جب سے فلم انڈسٹری میں بدعورت اداکاروں کی  
مانگ بڑھ گئی ہے تو جیسے آ باد سے بھی آتا ہے۔ ایکسٹرا کا سینہ  
چوڑا، ٹانگیں تیلی، آنکھیں گھٹی ہوئی اور سبھو میں منڈی ہوئی ہوتی ہیں۔  
اسکی جیب میں چنے اور منہ میں عبداللہ سگریٹ ہوتا ہے۔ اکثر داور  
بین روڈ پر ٹہلتا نظر آتا ہے۔

ایکسٹرا دو قسم کا ہوتا ہے۔ چھوٹا ایکسٹرا اور بڑا ایکسٹرا۔  
چھوٹے ایکسٹرا کا حال تو اوپر بیان ہو چکا ہے۔ بڑے ایکسٹرا کا حال بتاتے  
ہوئے ذرا ڈر لگتا ہے۔

ایکسٹرا۔ ایکسٹرا سے اونچی ذات کا ہوتا ہے۔ اسے  
ہر وقت کلا کا کیرا کاٹتا رہتا ہے۔ آرٹ اور فن کے میدان میں



وہ ایکسٹرا تو کبھی کسی ہیرو یا ہیروئن کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کا خیال ہے کہ فلمی دنیا کا سارا بھرم اس کے دم سے قائم ہے۔ اور یہ بات کچھ غلط بھی نہیں ہے، کیونکہ ایکٹر اپنے فن کا پجاری ہے اور فلم اپنے کمرشیل دھندوں کے باوجود ایک فن ہے جس کا پجاری ایکٹر ہے۔ مگر ایکٹر بننا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایک ڈاکٹر بننا۔ انجینئر بننا۔ اس میں علم اور تجربے کے ساتھ ساتھ خون پسینہ ایک کر دنیا پڑتا ہے۔ اس کام کے لئے دل اور روح کا انہماک چاہیے اور برسوں کی ریاضت۔ ہمارے فلم انڈسٹری بھی اچھے ایکٹروں سے خالی نہیں ہے بلکہ بعض تو ان میں سے اتنے اچھے اور اپنے کام کے اتنے ماہر ہیں کہ دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے فلم ایکٹر کے مقابلے پر رکھے جاسکتے ہیں۔ مگر اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ دل میں کام کی لگن ہو اور پیسے کا زیادہ لالچ نہ ہو۔ ست زندگی لٹن شرٹ پہننے سے اچھا ایکٹر نہیں بنتا، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایکٹر جذبات و احساس کی ست زندگی دنیا پر قادر ہو۔

اس لئے کہو۔۔۔ الف سے ایکٹر!

”الف سے ایکٹر ایس۔“

## ”لائف سے ایکٹر لیں“

کالی، پیلی، نیلی، گوری، اودی، عنابی — ایکٹر لیں  
 ہر رنگ کی ہوتی ہے اور سحر ہونے تک ہر رنگ میں چلتی رہتی ہے —  
 ایکٹر لیں بھی دساور سے آتی ہے اور اکثر حالتوں میں کسی کے ساتھ  
 بھاگ کر آتی ہے۔ اور بمبئی آکر کسی ہوٹل میں قیام کرتی ہے۔ اور اپنے  
 زیور و فروخت کر کے گزر کرتی ہے۔ اس کے بعد وہ فلم کمپنی میں اپنا  
 جسم بیچنے جاتی ہے — فلم کمپنی میں خوبصورت جسم کو آرٹ کہتے ہیں  
 اور پروڈیوسر سے لے کر سیٹ کے چیر اسی تک آرٹ کے شیدائی  
 نظر آتے ہیں — ایکٹر کے مقابلے میں ایکٹر لیں بہت جلد ترقی کر لیتی  
 ہے اور جتنی زیادہ خوب صورت ہوگی اتنی ہی جلدی ترقی کرے گی۔  
 بعض ایکٹر سوں کو ہیروئن بننے میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔ لیکن کئی ایک  
 خوش قسمت ایکٹر لیں ایسی بھی ہیں جو ایک ہی رات میں کامیابی کے  
 تمام مراحل طے کر لیتی ہیں۔ ہر فلم کمپنی ایکٹر لیں پر چلتی ہے — فلمی  
 زندگی کا محور ہی قتالہ ہے۔ !

ایکٹروں کی طرح ایکٹر لیں بھی دو قسم کی ہوتی ہیں۔ چھوٹی  
 اور بڑی —! چھوٹی ایکٹر لیں اکثر اپنے بھائی یا شوہر کے ساتھ دیکھی  
 جاتی ہے — بڑی ایکٹر لیں پروڈیوسر کی کار میں۔ کیونکہ اس کا کوئی

شوہر نہیں ہوتا، کوئی سبھائی نہیں ہوتا — بڑی ایکٹریس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سیٹ پر آکر سو جاتی ہے اور اس کا موڈ اکثر بگڑ جاتا ہے۔ !



## ”لوف سے اوٹ“

فلمی پردے کی اوٹ میں کیا ہوتا ہے۔ یہ نہ پوچھو تو بہتر ہے۔ جگرگانے ہوئے فلمی پردے کے پیچھے کتنا اندھیرا ہے اس کا بیان بہت مشکل ہے۔ پردے کی اوٹ میں ہیر و اور ہیر وین شاید ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے ہیں — لیکن پردے پر آکر ایک دوسرے سے محبت کرنے پر مجبور ہیں — ایک ایکٹریا دو دن کا سبک کا ہے لیکن فلم کے پردے پر وہ کھانے سے بھری ہوئی سماجی کوٹھوکر مارنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ اسے پارٹ ہی ایسا دیا گیا ہے ! وہ عورت جو فلم میں ایک شریف گریستن بنی ہوئی اپنے خاوند سے لاتین کھا رہی ہے گھر جا کر ہر روز اپنے شوہر کو پیٹتی ہے۔ !

اس لئے عرف پردے کی چمک ہی کو مدت دیکھو —



اس کی اوٹ کو بھی یاد رکھو اور کہو۔  
 "لف سے اوٹ۔"



"لف سے اشتہار"

کوئی فلم اشتہار کے بغیر نہیں چلتی۔ فلم بنانے سے پہلے  
 اشتہار دینا پڑتا ہے۔ فلم بننے کے بیچ میں اشتہار دینا پڑتا ہے۔ فلم بننے  
 کے بعد تو دھڑا دھڑا اشتہار دینے پڑتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے فلم کی  
 کامیابی کا یہ فارمولا بنا رکھا ہے۔

ہیرو — ہیروئن — اور اشتہار۔ !  
 ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر غور سے دیکھا جائے  
 تو فلمی ہیرو اور ہیروئن Sex اور گلیسر کے اشتہار  
 ہے۔ باقی سب آزار ہے۔

اسی لئے بعض فلم اسٹار۔ اشتہار کے لالچ میں اس قدر  
 بڑھ جاتے ہیں کہ ان کی ساری زندگی ایک کھلا اشتہار معلوم  
 ہوتی ہے۔ وہ انسان نہیں۔ اخبار کا ایک ورق معلوم ہوتے ہیں۔



”ب سے بابو جی :-“

ہر فلمی عورت جس کا سما جی درجہ سپر دین سے کم ہوتا ہے۔  
 وہ اپنے ساتھ ایک بابو جی لئے پھرتی ہے۔ یہ بابو جی بیک وقت  
 خاوند، پہرہ دار، عاشق اور غنڈے کے خرائیفن انجام دیتا  
 ہے اور بلا تفریق مذہب و ملت انجام دیتا ہے۔ بابو جی ہندو  
 بھی ہوتا ہے۔ مسلمان بھی ہوتا ہے۔ عیسائی بھی ہوتا ہے اور اگر ضرورت  
 آ پڑے تو سکھ بھی بن جاتا ہے۔ اپنے گھر میں دھوئی، پانچا  
 اور شلوار وغیرہ میں ملبوس دیکھا جاتا ہے۔ لیکن اسٹوڈیو میں  
 کوٹ تیلون پہنے نظر آتا ہے۔ کلائی پر سونے کی گھڑی، ہاتھ  
 میں کوکو کا ڈبہ اور گلے میں سرخ رومال باندھے رکھتا ہے۔ گھر  
 پر فلمی لڑکی کا سنا بھائی ہوتا ہے۔ اس کا باپ ہوتا ہے۔ ڈرائیور  
 ہوتا ہے۔ باورچی بھی ہوتا ہے۔ لیکن اسٹوڈیو میں آکر صرف  
 بابو جی کہلاتا ہے۔ پردہ پوش لوگ اس خطرے کی جھنڈی سے بہت  
 بدکتے ہیں اور اسے منہ مانگی تنخواہ دیتے ہیں۔ جس کا فلمی لڑکی کے  
 کانٹریکٹ میں کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ عشق کی طرح بابو جی پر بھی  
 زور نہیں ہے کیونکہ یہ وہ آتش ہے غائب جو دکائے نہ لگے اور





میں کتنا بھروسہ ہوتا ہے۔ مگر فلمی زندگی میں ہمیشہ بھروسہ رکھنا پڑتا ہے۔ اور ادھ کچر انہیں، بلکہ بالکل مکمل بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ فلمی اصطلاح میں اسے "ہنڈ ریڈ پرسنٹ بھروسہ" کہتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک ایکٹر کسی فلم پر وڈیو سر کے دفتر میں گیا۔ دونوں نے ہاتھ ملائے۔ گلے ملے۔ ایک دوسرے کا منہ چوما۔ پھر ایکٹر نے فلم پر وڈیو سر کی کمر میں ہاتھ ڈال کے کہا۔

"پیارے سنا ہے کچر شروع کر رہا ہے۔؟"

"ہاں میری جان۔"

"تو ہمیں کام نہیں دے گا ڈارلنگ؟"

"پکچر کس کے لئے بنا رہا ہوں سو بیٹ ہارٹ؟"

"تو میرا دل کدھر ہے سنی۔؟"

"ادھر ہے جانی!" فلم پر وڈیو سر نے اپنے دل پر ہاتھ

رکھ کر کہا۔ "اگلے بدھ کو آ جاؤ اور کانٹریکٹ سائن کر جاؤ

پیارے۔"

"پکارتے؟"

"بھروسہ ہنڈ ریڈ پرسنٹ!"

اگلے بدھ کو ٹھیک وقت پر ایکٹر فلم پر وڈیو سر کے گھر

پہنچ گیا۔ فلم پر وڈیوسرکسی غروری کام سے عین اسی وقت چلا گیا تھا۔  
نگرا بجڑ کے لئے پیغام رکھ گیا تھا۔

”اگلے بدھ کو غرور آ جانا، تمہارا کام ہو جائے گا۔ بھروسہ  
ہندو ریڈ پر سینٹ!“

ایکڑاگلے بدھ کو بھی گیا۔ اس سے اگلے بدھ کو بھی۔ اتنے  
بدھ کو گیا کہ اس کی ساری سدھ بدھ ماری گئی۔ اور کام پتھر بھی  
نہیں ملا۔ فلم پروڈیوسر نے دوسری فلم شروع کر دی۔ اب اس  
دوسری فلم میں اس ایکڑاگلے سے وعدہ کر لیا گیا ہے کہ کام ضرور ملے  
گا..... "سب پروڈیوسر پر سینٹ۔"

یہ سمجھو وہ ہندو پریسٹ ٹری حطرناک چینیڑ ہے۔  
 فلمی دنیا میں جہاں کسی نے آپ سے کہا — "بھروسہ ہندو پریسٹ  
 ..... سمجھ لو آپ کا کام نہیں ہوگا۔"

اگر بھروسہ فقہی پریسبیٹ ہو یا اس سے کبھی کم ہو تو کام ہونے کا چانس زیادہ ہے۔

لیکن اگر کہیں خدا نہ کرے "بھروسہ ہنڈ ریڈ پرسنٹ ہو گیا۔  
زندگی بھر جو آپ کا وہ کام ہو جائے۔

اس لئے فلم میں آنے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نہ

کسی دوسرے پر بھروسہ کریں۔ ہنڈ ریڈ پرسنیٹ۔ نہ اپنے آپ پر  
بھروسہ کریں۔ ہنڈ ریڈ پرسنیٹ۔ اگر آپ یوں سوچکر آگے بڑھیں گے  
تو غرور کا میاب ہوں گے۔

بس یہی ایک گڑ کی بات ہے۔ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔

ہنڈ ریڈ پرسنیٹ۔

مجھ سے بھروسہ ہنڈ ریڈ پرسنیٹ



”پ سے پروڈیوسر!“

پروڈیوسر فلم بنانے والے کو کہتے ہیں۔ مگر کیوں کہتے ہیں؟  
یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیونکہ آجکل ایک پروڈیوسر  
فلم کو کم بناتا ہے۔ قرضہ زیادہ چڑھاتا ہے۔ فلم بناتے وقت  
بڑے بڑے آرٹسٹوں کو بڑی بڑی تنفیلیاں دینے کے بعد اس بیچارے  
کے پاس بچتا ہی کیا ہے۔؟

ایک زمانہ تھا کہ فلم انڈسٹری میں پروڈیوسر کی بڑی دھوم  
تھی۔ فلم کمپنی کے دفتر میں اسٹوڈیو میں۔ سیٹ پر لوگ اسے دیکھتے  
ہی رعب سے کانپتے تھے۔ مہیرو اور مہیروین، موسیقار

اور شاعر ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے تھے۔ جدھر سے وہ گزرتا تھا لوگ اس کے سامنے جھک جاتے تھے۔ آج جدھر سے وہ گزرتا ہے اسے جھکنا پڑتا ہے۔

اسٹوڈیو میں سیر و اپنی لمبی گاڑی سے پہچانا جاتا ہے۔ سیر وین اپنی اماں سے پہچانی جاتی ہے۔ پروڈیوسر کو پہچانتے کا طریقہ بہت آسان ہے۔ اگر کسی فلم کی شوٹنگ کے دوران میں آپ کو کوئی ایسا آدمی نظر آئے۔ جو سب سے اداس پریشان، پیٹے حال، دکھی، مظلوم مجبور، ڈرا اور سہما ہوا دکھائی دے۔ تو سمجھ لیجئے کہ یہی اس فلم کا پروڈیوسر ہے۔

جو اناڑی باہر سے آتے ہیں۔ پروڈیوسر بننے کا شوق اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ مگر نہیں جانتے کہ پروڈیوسر بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ کو قانون کا خزانہ، سفیر کا دماغ اور کسی مہارشی کا گیان حاصل ہو۔ اگر آپ میں یہ تینوں خوبیاں موجود ہیں تو آپ پروڈیوسر بن سکتے ہیں اور فلم کمپنی کے بورڈ پر لکھ بھی سکتے ہیں۔

پ سے پروڈیوسر!





## ت سے تقدیر - !

ت سے تقدیر ہوتی ہے جس کے بنا کوئی تصویر نہیں چلتی ہے۔  
 کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تصویر ولیم کمار سے چلتی ہے یا راجکپور  
 سے یا دیوانند سے یا وجنتی مالا سے یا نیا کمار سے۔ کچھ لوگ  
 سمجھتے ہیں کہ تصویر رام شرما کی کہانی سے چلتی ہے یا بمل رائے  
 کی ڈائریکشن سے یا نوشاد کے سنگیت سے یا مجروح اور شیلیندر  
 کے گانوں سے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر تصویر کو اچھی پلےسٹی مل  
 جائے اور وہ کسی بڑے سینما ہال میں لگا دی جائے تو خود بخود چل  
 جاتی ہے۔ گمریہ سب باتیں غلط ہیں۔ اصل میں تصویر صرف تقدیر  
 سے چلتی ہے۔ !

اور تقدیر کا ٹھیکہ ممبئی میں دوسا دھوؤں نے لے رکھا  
 ہے۔ ایک ہیں بھجنگ بابا — دوسرے ہیں دینگ بابا — سب  
 فلم والے اپنی تقدیر پوچھنے کے لئے انہی دو باباؤں کے پاس جاتے  
 ہیں اور ان سے اپنی تقدیر کا کوٹہ لے کر آتے ہیں۔ کسی کو کم ملتا ہے  
 کسی کو زیادہ۔ مگر ملتا انہی سے ہے — ان دونوں باباؤں کے  
 دیوانہ سناں الگ الگ مقرر ہیں۔

آدھے فلم بنانے والے بھجنگ بابا کے قائل ہیں۔ آدھے  
 دنگ بابا کے — کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک فلم بنانے  
 والا جو اس سے پہلے بھجنگ بابا کا قائل تھا۔ اپنی فلم کے فیل  
 ہو جانے پر دنگ بابا کی ٹرن میں چلا جاتا ہے اور دنگ  
 بابا کو ماننے والا ان سے ناامید ہو کر بھجنگ بابا کا مرید ہو جاتا ہے۔  
 مگر اس سے پڑھاؤں کی مجموعی تعداد میں کیا فرق پڑتا ہے۔ ؟  
 پچھلے سال سے ایک اور بابا وارد ہوئے ہیں.....  
 کلنگ بابا — پہلے انہوں نے اپنی کٹیا بھجنگ بابا کے دیو  
 استھان کے سامنے بنائی، مگر دوسرے دن اکھاڑ کر پھینک دی  
 گئی۔ پھر انہوں نے دنگ بابا کے سامنے جا کے دھوئی رانی۔  
 وہاں سے بھی بیک بینی دو گوش نکالنے گئے۔

اب یہ شہر سے چھ میل باہرندی کے کنارے ایک پیٹر  
 کے نیچے پیٹھے ہیں۔ اور اب ان کا دھندا بھی چل نکلا ہے۔ وہ بات  
 تو نہیں ہے جو بھجنگ بابا یا دنگ بابا میں ہے۔ مگر ہاں چھوٹی  
 چھوٹی تیسرے درجہ کی فلمیں بنانے والے اس تیسرے بابا کے پاس  
 جانے لگے ہیں۔ اور اپنی تقدیر کی مرمت کرانے لگے ہیں۔  
 مگر اتنی بڑی فلم انڈسٹری کے لئے تین سادھو بہت

کم ہیں۔ سوچتا ہوں میں پتنگ بابا بن جاؤں۔ سر پر اکھ اور  
منہ میں خاک ڈال کر لوگوں پر اپنی دھاک جماؤں اور ٹھکی دیکر  
کہوں، لے بچہ۔

ت سے تقدیر.....!



”ت سے نکون!“

ایک جیو میٹری کی نکون ہوتی ہے۔ ایک محبت کی نکون  
ہوتی ہے۔ جیسے ہیسرو وین اور ہول۔ یہ تینوں  
مل کر محبت کی نکون بناتے ہیں۔ جیسے ولن، ایکسٹرا لڑکی اور  
سمندر مل کر محبت کی دوسری نکون بنتی ہے۔

ایک نکون کہانی میں بنائی جاتی ہے۔ جیسے ہیسرو  
مہیسرو وین ولن۔ کبھی ولن ایک آدمی ہوتا ہے۔ کبھی سماج ہوتا  
ہے، کبھی حالات ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی حادثہ ہوتا ہے۔ یہ ولن،  
مہیسرو اور مہیسرو وین کو ملنے نہیں دیتا۔ اس کی وجہ سے نکون  
کھڑی رہتی ہے۔ ولن کو ہٹا دیجئے نکون بیٹھ جائے گی اور فلم  
بھی پلے سین بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لئے ہر کہانی میں نکون کا

ہونا ضروری ہے۔

ایک تکنون فلمی نرٹس کی بھی ہوتی ہے۔ جسے فنالسٹر۔  
پروڈیوسر۔ ڈسٹری بیوٹر ! اس تکنون میں پروڈیوسر اور ڈسٹری  
بیوٹر دونوں مل کر کے فنالسٹر کے برابر ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی  
اس تکنون میں کوئی ہیروئن آجاتی ہے اور تکنون کی بجائے چو  
کون بن جاتی ہے اور فلم ناکمل رہ جاتی ہے کیونکہ چوکون سے  
جیومیٹری کی شکل تو بن سکتی ہے فلم نہیں بن سکتی۔ فلم کے لئے  
صرف تکنون چاہیے۔

پرانے شاستروں میں لکھا ہے کہ یہ دنیا ایک سیل  
کے سینک پر کھڑی ہے تپہ نہیں یہ خبر کہاں تک سچ ہے  
لیکن یہ تو بالکل سچ ہے کہ ہماری فلم انڈسٹری محبت کی تکنون پر  
کھڑی ہے۔

اس لئے اگر فلم بنانا ہے تو ایک طرف سے ہیرو کو  
لائے دوسری طرف سے ہیروئن کو بیچ میں ولن کو بٹھائیے  
اور کہیے۔ !

”ت سے تکنون۔“





”تھ سے تھیلی۔!“

تھ سے تھیلی ہوتی ہے، مگر نظر کس کو آتی ہے اور ملتی کس کو ہے۔ سارا جھگڑا اسی تھیلی کا ہے اس دنیا میں! فلم والے بھی اس دنیا سے باہر نہیں ہیں۔ اس لئے ہر وقت تھیلی کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ نہ تو عوام کا اخلاق سدھارنے کے لئے پچھ رہا ہے نہ ان کے ذوق نشاط کو سنوارنے کے لئے۔ وہ صرف تھیلی کے لئے دینا چاہتا ہے۔

مجنون جنگل میں لیلیٰ لیلیٰ کرتا گھومتا تھا۔ فلمی جنگل کے مجنوں تھیلی تھیلی کہتے گھومتے ہیں۔ لیلیٰ کا ملنا آسان ہے۔ مگر تھیلی کا ملنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے فلمی دنیا میں اکثر لوگوں کی زندگی ایک تھیلی سے شروع ہوتی ہے اور ایک تھیلے پر ختم ہوتی ہے جس میں وہ گھر کے لئے سبزی ترکاری بھر کر اپنی کمر سے لٹکائے بازاروں میں گھومتے ہیں۔ اور بے زبان حال کہتے ہیں۔

مانگی تھ سے تھیلی، مل گیا تھیلہ۔!



”ٹ سے ٹاکی“

آجکل کی فلموں کو ”ٹاکی“ کہا جاتا ہے۔ یعنی بولتی فلمیں !  
 ایک زمانہ ہیں۔ ”سائلنٹ“ یعنی خاموش فلمیں بنتی تھیں۔ جن کا اور  
 کوئی فائدہ ہوتا ہو۔ ایک فائدہ ضرور تھا کہ ان فلموں میں عورت  
 بول نہیں سکتی تھی ! اور میرے خیال میں دنیا میں یہی ایک جگہ  
 ایسی تھی جہاں عورت بول نہیں سکتی تھی۔ اسی لئے اس زمانے میں  
 شریف گھر کی جھائیں جھائیں سے گھبرا کر سینما ہال کا رخ کرتے تھے  
 اور ٹکٹ خرید کر تین گھنٹے تک ایک خوبصورت عورت کو چپ  
 چاپ فلم میں کام کرتے ہوئے دیکھتے تھے۔ آجکل تین گھنٹے  
 تو کیا تین منٹ تک خاموش رہنے والی عورت کا ملنا مشکل ہے کیونکہ  
 آجکل فلمیں بولنے لگی ہیں اور بولنے والی فلموں میں بھی آجکل ایسے  
 ”ٹاکی“ کی فلمیں بننے لگی ہیں جنہیں فمیلی کچپرز کہا جاتا ہے۔ ان فلموں  
 میں نہ صرف عورت بولتی ہے بلکہ اس کے بچے بھی بولتے ہیں۔ اس  
 کی بہنیں بھی بولتی ہیں۔ اس کے ماں باپ، ساس، سر، بھائی  
 بھتیجے، نندیں، بھابھیاں سب کبھی باری باری اور کبھی اکٹھی  
 بولتی ہیں۔ اور سینما دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ جس گھر سے

وہ بھاگ کر آیا تھا پھر اسی گھر میں لوٹ گیا ہے۔

بولنے والی فلموں کے بعد سنا ہے اب سونگھنے والی فلمیں

Smellien سننے لگی ہیں۔ ان فلموں میں جب ہیروئن اپنے

کپڑوں میں عطر لگائے گی تو اس کی خوشبو، آپ تک پہنچا دی جائیگی، جب

ہیرو کسی بوتل میں کھانا کھائے گا۔ تو کھانے کی خوشبو آپ تک آ جائے گی۔

کسی باغ کا منظر دیکھ کر آپ نہ صرف مختلف پھولوں کو دیکھ سکیں گے بلکہ ان

کی خوشبو بھی سونگھ سکیں گے۔ ایسی فلمیں تیار ہو رہی ہیں۔

اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ سونگھنے والی فلموں کے بعد ایسی فلمیں

تیار ہونے لگیں جو کھانے پینے والی "فلمیں کہا جاسکے یعنی ادھر ہیرو

نے گلاس اٹھایا ادھر جام آپ تک پہنچ گیا۔ ہیرو دینے ستالی

پروسی اور کھانا آپ تک پہنچ گیا۔ ممکن ہے اس وقت لوگ فلم دیکھنے

کے ساتھ ساتھ اپنا بیخ اور ڈنر بھی سینما ہال میں کھایا کریں گے۔

مگر وہ زمانہ ابھی دور ہے۔ ابھی تو بولنے والی فلمیں دیکھئے

اور سنئے۔ اور اس کے بعد اگر بہت ہو تو کہیئے۔

”ٹ سے ٹاکی۔!“



”ٹھ سے ٹھگ !“

آپ نے بنا رسی ٹھگ کا نام سنا ہوگا۔ میں نے بھی بچپن سے سن رکھا تھا۔ لیکن دیکھا نہیں تھا۔ اس لئے ایک دفعہ میں اپنے دفتر سے تین مہینے کی چھٹی لے کر بنا رسی گیا۔ ٹھگ دیکھنے کے لئے ! سارا بنا رسی چھان مارا، کہیں پر کوئی ٹھگ نہیں ملا۔ آخر زور لگا لگا کر گڈنگا کے کنارے مجھے ایک بوڑھا ٹھگ رام۔ رام جپتا ہوا مل گیا۔ کیونکہ وہ ٹھگی چھوڑ چکا تھا۔ ! جب اس نے میری بیٹاسنی تو اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بڑی شفقت سے بولا۔ ”بیٹا۔ تیری تلاش فضول ہے۔ تجھے اب بنا رسی میں کوئی ٹھگ نہیں ملے گا۔ کیونکہ بنا رسی میں جتنے ٹھگ تھے، سب کے سب بھٹی چلے گئے ہیں۔ فلمی دنیا میں۔ تو اگر سچ چمچ ٹھگ کو دیکھنا چاہتا ہے تو ٹکٹ کٹا کر ابھی بھٹی چلا جا۔ وہیں تیرے من کی مراد پوری ہوگی۔ !“

میں نے اس بڑھے نیک ٹھگ کے آگے سیس نوا یا اور اسی وقت اسٹیشن آیا۔ اور بھٹی کا ٹکٹ کٹانے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا۔ بھوا غائب ہے۔

غیر میں کسی نہ کسی طرح سے بھٹی پہنچ گیا۔ بھٹی سینٹرل



نے باہر نکلتے ہی مجھے ایک آدمی نے گھیر لیا۔ بولا۔

"میسرو بنے گا۔؟"

میں نے کہا۔ "میسرا چہرہ تو گھوڑے کے موافق ہے۔

میں کیسے میسرو بنے گا۔؟"

وہ بولا۔ "واندہ نہیں!" پھر میری بیوی کی طرف

الٹ کر بولا۔

"اپنی بی بی کو میسرو بنائے گا۔؟"

میں نے کہا۔

"یہ بے چاری چھ بچوں کی ماں ہے۔!"

"واندہ نہیں۔" وہ سر ہلا کر بولا۔ "تیرے بچوں کو

فلیم میں کام دلانے گا۔۔۔ ڈیری ایرانی بنادے گا۔!"

میں نے کہا۔

"میرے سب بچے اسکول جاتے ہیں۔!"

وہ بولا۔ "واندہ نہیں!" پھر میرے بالکل

قریب آ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "کچر

بنائے گا۔؟"

میں نے کہا۔ "کچر کتنے میں بنتی ہے؟"

”پانچ لاکھ میں بھی بنتی ہے اور پچاس لاکھ میں بھی بنتی ہے۔“

وہ بولا۔

”میسر پاس تو پانچ ہزار بھی نہیں۔!“

”وہ انداز نہیں۔“ وہ بولا۔ ”تم تین ہزار نکالو۔ ہم باقی

کا پارٹنر لاکے دیتا ہے۔!“

”مگر میرے پاس تو تین سو بھی نہیں ہیں۔!“

اس نے تیز چبھتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ایک انگلی

اٹھا کر بولا۔ ”سیٹھ تیرے مستک پر سلور جلی لکھا ہے۔ تو بچپن

بنائے گا۔ تو لاکھوں کمائے گا۔ اس لئے بولتا ہے ہم تم کو.....

لا۔ تیس روپے ہی نکال۔ ہم باقی کا ایڈوانس اپنی جیب سے ڈال کر

فیس بلڈنگ میں تیری فلم کمپنی کا پائیہ دگاتا ہے۔ تیرا نام کیا ہے؟

”گھاسی رام!“

”بہت اچھا نام ہے۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے سر ہلا کر بولا۔

”ہم تیرے نام پر تیری کمپنی کا نام رکھے گا۔“ دی گریٹ گھاسی بیٹ

کمپنی آف مودی میگزین!“ بول کیسا نام ہے۔“

”بہت اچھا نام ہے، مگر میرے پاس تیس روپے بھی نہیں

ہیں۔ صرف پانچ روپے ہیں۔!“

"تیرے مستک پر سلور جہلی لکھا ہے۔ اس لئے ہم تیرے سنگ  
اتنا اتھا پھوڑی کرتا ہے۔ ورنہ ہم تیرے سنگ بات نہیں کرتا تھا۔  
وہ آدمی بڑی شفقت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اچھا۔۔۔ پانچ  
روپے ہی نکال۔ گاڑی بھاڑا کے لئے۔ ہم ابھی میکسی لے کے جاتا  
ہے اور ایک دلال کو لے کے آتا ہے۔ جو باقی پانچ لاکھ کا بند و بست  
کرے گا۔ تیری فلم کمپنی کے لئے۔"

جب وہ مجھ سے پانچ روپے لے چکا۔ تو بولا۔ "ہم ابھی آدھے  
کلاک میں آتا ہے۔"

وہ چلا گیا اور مجھے پانچ لاکھ کے سپینوں میں کھویا ہوا اچھوڑ  
گیا۔ میں نے طے کیا کہ ان پانچ لاکھ سے میں سب سے پہلے اپنے لئے  
ایک گاڑی لوں گا۔ پھر ایک فلیٹ لوں گا۔ پھر سوچنے لگا کہ  
میں اپنی فلم میں سادھنا کو لوں گا کہ آشنا پارک بکھ کو۔ یا اسی ادھیڑ  
میں میں آدھا کلاک گزر گیا۔ پھر پورا کلاک گزر گیا۔ پھر سارے  
کلاک کی ساری سوئیاں گھوم گئیں۔ مگر وہ نہ آیا۔ میرے من کا میت  
تو میں نے بھوک سے چلا کر کہا۔  
ٹھہ سے ٹھگ۔!

”ث سے ثبوت!“

اگر آپ دکیلوں کا گون مپن کر ہائی کورٹ میں جرح کرنے جاتے ہیں۔ تو یہ کم از کم اس بات کا ثبوت ضرور ہے کہ آپ ایل۔ ایل۔ بی ہیں اور آپ کے پاس قانون کی ڈگری موجود ہے۔

لیکن اگر آپ کسی فلم کے پروڈیوسر ہیں۔ تو یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ آپ کے پاس فلم کے آرٹ کی کسی طرح کی جانکاری موجود ہے۔ یا کسی قسم کا فلمی تجربہ، یا اسکی ٹیکنک سے واقفیت یہ محض اس امر کا ثبوت ہے کہ آپ نے یا تو کسی نگہے سیٹھ کو پھانس لیا ہے۔ یا آپ کے مہیسرو کبیر والا کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے اور یا کہیں سے بلیک کا بڑا ہاتھ لگا ہے۔ فلمی دنیا میں اس طرح کے اور بھی بہت سے ثبوت پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ کے پاس ایک گاڑی ہے۔ تو یہ کسی امر کا ثبوت نہیں ہے۔ فلمی دنیا میں گاڑی تو ہر جانے پہچانے آدمی کے پاس ہوتی ہے۔

لیکن اگر آپ کے پاس ایک کیڈ لاک ہے تو آپ یقیناً اچھے فن کار ہیں۔ شیورلیٹ ہے تو بڑے فن کار ہیں۔ اور اگر امپالہ ہے تو یہ اس کا عظیم ثبوت ہے کہ آپ ایک عظیم فن کار ہیں۔

اگر آپ کسی فلمی رسالے میں کسی پروڈیوسر کا یہ اعلان پڑھیں۔



کہ میں تو فلاں ہیروئن کو اپنی بیٹی برابر سمجھتا ہوں۔ یا اگر کوئی ہیرو  
اعلان کر دے کہ فلاں ہیروئن کو میں اپنی بہن سمجھتا ہوں۔ تو یہ اس امر  
کا ثبوت ہے کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔

اگر کوئی ہیروئن یہ بیان دے کہ وہ ابھی تک غیر شادی  
شدہ ہے، اور اس کے متعلق شادی کی جو افواہیں مشہور ہو رہی ہیں  
وہ سب غلط ہیں۔ تو یہ اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ اس ہیروئن  
کی شادی ہو چکی ہے۔

فلمی دنیا میں جو کہا جاتا ہے وہ ثبوت نہیں ہوتا۔ بلکہ  
جو نہیں کہا جاتا وہ ثبوت ہوتا ہے۔  
”ث سے ثبوت“



”ج سے جادو۔ ا“

جادو کی فلمیں بہت قیمتی ہیں ہمارے دلش میں کیونکہ اس دلش  
میں کاہل اور کام چور بہت رہتے ہیں۔ اس لئے ہر کام جادو کے چھوٹتر  
سے کرا لینا چاہتے ہیں۔ اس لئے ایسی فلمیں دیکھنے والوں کی تعداد بہت  
زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ان میں جادو ٹونے

کا کام بہت دکھایا جاتا ہے۔ منتر پڑھا۔ تو ہیرہ ہوا میں اڑنے لگا۔  
 منتر پڑھا۔ تو ہیرہ دین کا محل انہی جگہ سے اٹھ کر کسی پہاڑ کی چوٹی سے  
 جا لگا۔ منتر پڑھا۔ تو پانی کا دریا آگ کے دریا میں تبدیل ہو گیا۔  
 ایسی فلموں میں آدمی کچھ کام نہیں کرتے۔ وہ صرف منتر پڑھتے ہیں باقی سب  
 کام جن کرتے ہیں۔ وہی سٹرکیں بناتے ہیں۔ وہی عمارتیں۔ وہی پہاڑ  
 کاٹتے ہیں اور سمندروں پر پل باندھتے ہیں۔ آدمی صرف محبت کرتے  
 ہیں۔ یا ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں۔

ایسی فلموں میں ہیرہ یا ہیرہ دین کی کوئی خاص اہمیت  
 نہیں ہوتی۔ اگر ہیرہ کسی وجہ سے اکڑنے لگتا ہے تو اسے فوراً جادو کا  
 ڈنڈا دکھا کے کبھی بنا دیا جاتا ہے۔ ہیرہ دین نخرے دکھانے لگتی  
 ہے تو اسے جادو کے زور سے بیٹا بنا کر کسی پنجرے میں ڈال دیا جاتا ہے۔  
 اب کرو نخرے! ساری فلم میں پنجرے میں ٹنگی ٹنگی رو یا کر وگی۔!  
 اسی لئے تو بڑے بڑے اداکار جادو کی کسی فلم میں کام نہیں کرنا پسند  
 کرتے! کیونکہ وہاں نخرے دکھانے کا موقع نہیں ملتا۔!



ج سے جیوتشی بھی ہوتا ہے۔ جس کے لغیر جیوتشی

فلم کا کوئی کام شروع نہیں ہو سکتا — فلم کا مہورت جیوتشی طے کرتا ہے۔ ریلیسز جیوتشی طے کرتا ہے۔ پریمیر جیوتشی طے کرتا ہے — کس سیروکے ساتھ کون سی سیروین چلے گی؟ ..... وہ جیوتشی طے کرتا ہے — فلم کتنے ہفتے چلے گی؟ وہ جیوتشی طے کرتا ہے — اور اگر نہیں چلی تو کس "گرہ" کی وجہ سے نہیں چلی، تو وہ بھی جیوتشی طے کرتا ہے اور بے چارہ پروڈیوسر طے کرتا ہے۔؟ — کہ وہ اور کبھی کیا سکتا ہے؟

فلمی جگت میں دو طرح کے جیوتشی پائے جاتے ہیں پرانے — وہ جو آسمان کے ستاروں کو دیکھ کر، کنڈلی بناتے ہیں — نئے ..... وہ جو فلم کے ستاروں کو دیکھ کر نکشتر جاتے ہیں۔! پرانے کہتے ہیں۔ "آٹھویں گھر میں سورج ہے۔ چھٹے میں چندرما ہے۔ نویں میں بدھ ہے اور پانچویں میں برہمپت ہے۔ پچیسر غرور سلور جلی کر لگی۔!"

نئے کہتے ہیں۔ "پیلے گھر میں دلیپ ہے، دوسرے میں وجیدہ رحمان ہے، تیسرے میں۔ پران ہے، چوتھے میں جانی واکر ہے، پانچویں میں سیکنی کلر ہے۔ چھٹے میں ایس ڈی برمن ہے — پچیسر چلے ہی چلے۔!"

آجکل پرانے جیوتشیوں کی جگہ نئے جیوتشی لے رہے ہیں۔  
اگر تم فلمی ستاروں کی چال سمجھتے ہو۔ اور کسی بڑے فلمی ستارے کو  
کسی فلمی کنڈلی کے گھر میں بٹھا سکتے ہو۔ تو تمہارا مستقبل محفوظ  
ہے۔ پھر زندگی بھر۔ "راہو اور کیتو" تمہارے گھر کی طرف نہ بکھیں  
گے۔ !

اب جی چاہے تو ج سے کہو جادو۔۔۔ جی چاہے تو ج  
سے کہو جیوتشی۔۔۔ ایک ہی بات ہے۔ !



"جہ سے جھانسو۔ !"

اسے سمجھنے کے لئے ایک گفتگو کا ٹیپ ریکارڈ سنو !  
ایک فلم کمپنی کے مالک اور جگن بھائی دلال کے درمیان .....  
مالک :- جگن بھائی۔ اپنی نئی کچھر کے لئے راجپور کو لیتا چاہتا  
ہوں۔ تمہارے تعلقات کیسے ہیں اس سے ؟

جگن :- راجپور تو سدا اپنی جیب میں رہتا ہے۔ !

مالک :- اور جینتی مالا۔ ؟

جگن :- وہ تو اپنی مٹھی میں ہے۔ !



مالک :- اور پران :-

جگن :- اجی پران تو اپنا لنگوٹیا ہے ۔ !

مالک :- اور تیواڑی :-

جگن :- تیواڑی تو اپنا بچہ ہے ۔ !

مالک :- مگر میری کہانی میں دو ہیرو ہیں ..... (سوچ کر) دیو

آنند کیسا رہے گا ۔

جگن :- لے لو ..... میں تو اپنی ایک جیب میں دیو آنند کو رکھتا

ہوں ۔ دوسری جیب میں راجکپور کو !

مالک :- ذرا اپنی جیب تو دکھاؤ ۔

جگن :- (گھبرا کر) کیا مطلب ۔

(کمپنی کا مالک جلدی سے جگن بھائی کی پٹیلوں کی دونوں

جیبوں میں ہاتھ ڈال کے انہیں الٹ دیتا ہے ۔)

مالک :- ارے جگن بھائی ۔ تمہاری جیب میں تو عرف ڈوکھوٹی

چوٹیاں ہیں ۔ !

یہ فلمی جھانسنے کی ایک معمولی سی مثال ہے ۔ زندگی کے دوسرے

کاروبار میں بھی جھانسنہ ہوتا ہے ۔ مگر کبھی کبھی ہوتا ہے ۔ اور بڑا خطرناک

ہوتا ہے ۔ مگر فلمی دنیا کے دائرے کا ہر پالسنہ ایک جھانسنہ ہوتا ہے ۔

اور بے حد معصوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جھالسنہ دینے والا جانتا ہے کہ وہ جھالسنہ دے رہا ہے۔ اور جس کو جھالسنہ دیا جا رہا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ مجھے جھالسنہ دیا جا رہا ہے۔ اس لئے کسی کو کسی سے نقصان نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ فلمی دنیا میں کسی کو نقصان پہنچانے کی غرض سے کوئی جھالسنہ نہیں دیا جاتا۔ بلکہ محض ایک دوسرے کو خوش کرنے کے لئے یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اس لئے بچو! تم بھی خوش ہو کر یہ کھیل کھیلو۔ اور کہو۔

”جھ سے جھالسنہ۔!“



”ج سے چچی۔!“

یہ وہ چچی نہیں ہے جو چائے میں شکر انڈ بلیتا ہے۔ بلکہ وہ چچی ہے جو ہوتا تو آدمی ہے لیکن ہر وقت پروڈیوسر، سپر و سہیروین یا اپنے سے کسی بھی اونچے درجے کے آدمی کے کان میں شکر انڈ بلیتا رہتا ہے۔ اور بیٹھی بیٹھی باتوں کا شہد گھونٹا رہتا ہے۔ متواتر شکر انڈ لینے سے اس کی شکل بھی بالکل چچی کی طرح ہو جاتی ہے۔ اسی لئے فلم کی اصطلاح میں ایسے آدمیوں کو چچی کہتے ہیں۔

ہر بڑا آدمی اپنی گاڑی کی لمبائی اور اپنے چھپوں کی تعداد سے  
پہچانا جاتا ہے۔

معمولی بڑا آدمی ایک آدھ چھپ اپنے ساتھ رکھتا ہے بہت  
بڑا آدمی آدھی درجن چھپے ہر وقت اپنی گاڑی میں ٹھوسٹائے رہتا ہے۔  
متواتر شکر کھانے سے بڑے آدمیوں کو اکثر ذہنی ذیابیطس  
*Mental Diabetise* کی بیماری ہو جاتی ہے۔ اور اس قدر  
بڑھ جاتی ہے کہ وہ سھر کوئی کڑوی اور سچی بات نہیں سن سکتے۔  
یہ بھی چھپے گیری کا کمال ہے۔ !

سننے میں شکر پر کنٹرول ہو چکا ہے۔ مگر چونکہ چھپوں پر کنٹرول  
نہیں ہے۔ اس لئے یہ لوگ بلیک سے شکر لاکر اپنے مالک کے کان میں  
انڈیلتے رہتے ہیں اور اپنا الو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔ مجھے ایک دفعہ  
ایک بہت بڑے فلمی آدمی کے گھر میں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ کھانے  
کی میز انواع و اقسام کے کھانوں سے سجی ہوئی تھی۔ ہر طرح کے ڈرنک  
موجود تھے۔ قیمتی چائنا کی پلیٹوں سے ساری میز جگمگا رہی تھی۔ مگر ہمارے  
میزبان نے جب میز دیکھی تو فوراً بھڑک کر غصے میں اپنے قریب کھڑے  
ہوئے ایک آدمی سے کہا۔

”یہ کیا بکو اس ہے؟ تم کو میز لگانے کو کہا تھا۔ کیا میسر

اسی طرح سے لگائی جاتی ہے۔“

وہ آدمی فوراً شرمندہ ہو کر بولا۔

”حضور، کیا غلطی ہو گئی اس خاکسار سے؟“

مالک گرج کر بولا۔ ”میں پوچھتا ہوں اس مہینہ پر چھپے

کیوں نہیں رکھے۔“

اس پر وہ آدمی فوراً درست بستہ ہو کر بولا۔ ”حضور ہمارے

ہوتے ہوئے چھپوں کی کیا ضرورت ہے۔“

اس دنیا میں صرف دو طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک

وہ جو چھپے ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو چھپے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

تیسری طرح کا آدمی کوئی نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا ہے تو اسے اس

دنیا میں کوئی نہیں پوچھتا۔ اس لئے بچو! شکر کھاؤ اور شکر

کھلاؤ۔ اور کہو۔

”ج سے چھپے۔“



”چھ سے چھپیا۔“

فلمی دنیا میں چھپیا کی کمی ہر لمحے محسوس ہوتی رہتی ہے۔



پر ڈیو سر کہتا ہے۔۔۔ "ارے فلم کہانی سے نبائیں۔ کوئی چھمیا نظر نہیں آتی!" کیرن مین کہتا ہے۔ "ارے کیرن کہاں چلائیں؟ کوئی چھمیا تو دکھائی دے!" ڈسٹری بیوٹر کہتا ہے۔ "ارے اس فلم میں سب کچھ ہے۔ بس ایک چھمیا نہیں ہے۔!"

ان لوگوں کی باتیں سنکر یہ خیال آتا ہے کہ "چھمیا" کوئی پارس پیچر ہو گا۔ جس کے حاصل کرنے کے لئے فلم والے ہر وقت تڑپتے رہتے ہیں۔

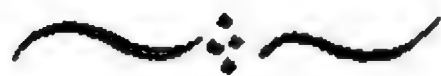
مگر یہ بات نہیں ہے۔! "چھمیا" کا لفظ تو بصورتِ لٹری کی لئے بولا جاتا ہے۔! ایک دفعہ ایک فلم نبی تھی "چھمیا" اس میں جس ہیر دین نے کام کیا تھا۔ وہ لوگوں کو اسٹندرڈ حسین دکھائی دیا کہ جب سے ہر سندر می کو چھمیا کہا جانے لگا۔

چھمیا کی تلاش میں فلم والے ہر سال حیدر آباد، لکھنؤ، کلکتہ، چنڈی گڑھ۔ دلی۔ کہاں کہاں ڈول ڈالتے رہتے ہیں۔ مگر حسن تو ایک نایاب شے ہے۔ تیل کا کنواں کھود لینا آسان کام ہے۔ مگر ایک چھمیا کو ڈھونڈ نکالنا بہت مشکل ہے۔

چھمیا بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ اور جب ملتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک شوہر ہے یا ماں باپ ہیں! جو

کسی طرح اپنی چھپیا کو فلم میں بھیجے کے لئے راضی نہیں ہیں۔  
ایسے موقعوں پر چھپیا کے ساتھ اس کے شوہر اور اس کے ماں  
باپ کو بھی کام دیتا پڑتا ہے۔ کچھ لوگوں نے فلم میں کام حاصل  
کرنے کا یہ آسان گردِ یافت کر لیا ہے کہ وہ اپنے ساتھ  
ایک چھپیا کو بھی لے آتے ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ چھپیا کے  
لئے چھپیا ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ ایکٹنگ کی صلاحیت بھی  
ہونی چاہیے۔ اور تھوڑی سی عقل بھی چاہیے۔ اب قدرت نے  
یہ عجیب مذاق کر رکھا ہے۔ وہ اگر کسی کو شکل دیتی ہے تو عقل نہیں  
دیتی اور عقل دیتی ہے تو شکل نہیں دیتی۔ لیکن جس چھپیا کے پاس  
یہ دونوں چیزیں موجود ہوں، اس کا فلم میں ترقی کرنا کچھ مشکل  
نہیں ہے۔ !

اس لئے ہر چھپیا کو فلم میں آنے سے پہلے دیکھ لینا چاہیے۔  
کہ وہ اچھی شکل کے علاوہ اداکاری کرنے کی عقل بھی رکھتی ہے کہ  
نہیں۔ ورنہ وہ چھپیا ایک دن بالکل نکمیا ثابت ہوگی۔  
اس لئے چھ سے چھپیا۔ !



”ح سے حقّہ۔ ا“

فلمی دنیا میں کام کرنے والے ہمیشہ سگریٹ پیتے ہیں اور کبھی حقّہ کے نزدیک نہیں جاتے۔۔۔ نہ گھر پر نہ اسٹوڈیو میں۔ نہ دفتر میں۔ کہیں پر وہ اپنے استعمال کے لئے حقّہ نہیں رکھتے۔ صرف سگریٹ پیتے ہیں۔ اور اپنے درجے، عادت، مزاج یا جیب کے مطابق سگریٹ کا شوق کرتے ہیں۔۔۔ نہایت ناکام لوگ نہایت اعلیٰ درجہ کا سگریٹ پیتے ہیں۔ اور جو انتہائی کامیاب ہیں اور لاکھوں روپیہ کماتے ہیں۔ وہ سونے کے سگریٹ کیس میں صرف بڑی ڈال کر پیتے ہیں۔ جو آدمی جتنا گھٹیا سگریٹ پئے گا۔ اتنا ہی کامیاب اور مال دار سمجھا جائے گا۔۔۔ مگر حقّہ کو کوئی بھی ہاتھ نہیں دگائیگا۔ مگر جب ایکٹرمندر جانے لگے۔ ایکٹریس گھر پر ڈال بگھارنے لگے اور پروڈیوسر حقّہ پینے لگے۔ تو سمجھ لو کہ ان کے برے دن آگئے۔۔۔ سمجھ لو کہ انہوں نے صبر کر لیا ہے اور اب وہ جلد ہی فلمی دنیا سے کنارہ کش ہونے والے ہیں۔۔۔ ایسے وقت میں پروڈیوسر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔۔۔ اور زور کا ایک کش لے کر کہتا ہے۔

ح سے حقّہ

## ”خ سے خالی۔“

فلیم انڈسٹری میں کام کرنے والوں کی زندگی کا ایک حصہ کام کرنے میں اور بہت سا حصہ کام نہ کرنے میں خرچ ہو جاتا ہے مگر مزے کی بات یہ ہے کہ فلیم انڈسٹری میں کبھی کوئی خالی ہاتھ نظر نہیں آتا۔ اور جو جتنا خالی ہوتا ہے۔ یعنی جس کے پاس جتنا نام کم ہوتا ہے وہ اتنا ہی معروف نظر آتا ہے۔

میں اپنے ایک دوست اکیٹر کو جانتا ہوں جس کے پاس پچھلے دو سال سے کوئی کام نہیں تھا۔ اور جو ابھی چند دن ہوئے مجھ سے پچاس روپے مانگ کے لے گیا تھا۔ میں نے ایک پر ڈیڑھ کی مدت سماجت کر کے اسے کام دینے پر راضی کیا۔ اور اسے اکیٹر کے گھر پر لے گیا۔ خالی اکیٹر بڑے پتاک سے ملا۔ وہ ضرور ہمیں چائے آفر کرتا۔ مگر نوکر حجامت کرائے گیا تھا۔ ضرور شراب پلاتا۔ مگر گنجت پر پٹ ختم ہو چکا تھا۔ سگریٹ بھی پیش کرتا۔ مگر جب سے اس نے امریکی ڈاکٹروں کا بیان پڑھا تھا کہ سگریٹ پینے سے کینسر ہو جاتا ہے۔ اس نے مہمانوں کو سگریٹ پیش کرنا

بند کر دیا تھا۔ !

خبیر ! آدم برسر مطلب۔ میں نے اس سے کہا۔

"خالی ہو۔ ؟" ایک رول کرو گے۔ ؟

"خالی"۔۔۔ ؟ وہ ایکسٹرزور کا ایک قہقہہ لگتا ہے بولا۔

میں۔۔۔ ؟ اور خالی۔۔۔ ؟ آٹھ کچیریں ہیں ہمارے پاس۔۔۔

دو چوڑے کی۔ ایک کے آصفت کی ایک بل رائے کی۔ تین واڈیا

کی۔ اور ایک نئے پوڈیوسر کی ابھی کل ہی کانٹرکٹ کیا ہے۔ بیس

باز ہیں۔ !

"تب تو آپ خالی نہیں ہیں۔۔۔" میں نے تقریباً آذرہ

ہو کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہم جانتے ہیں۔ !"

ایکڑے فوراً مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ٹیجا دیا۔۔۔" کہاں

جاتے ہو۔ ؟" تم ان کو لے کے آئے ہو۔ تو کسی نہ کسی طرح وقت تو

نکالنا ہی پڑے گا۔۔۔ تمہاری خاطر۔ !"

"مگر یہ لوگ تو ایک چھوٹی سی پکچر بنا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"دو ہزار سے زیادہ دام نہیں دے سکتے۔ !"

"بڑی پکچر کے۔ بڑے دام۔ چھوٹی پکچر کے چھوٹے

دام۔ !" ایکسٹرزور مسکرا کر بولا۔ "اور پکچر یہ تمہارے دوست



ہیں۔ تو بھو آج سے میرے بھی دوست ہوئے۔ اور دوستوں  
کے لئے قربانی تو کرنا ہی پڑتی ہے۔ بیٹھونا۔ چائے پیو۔  
دیکھتا ہوں وہ کمبخت نوکر حجامت کرا کے آیا کہ نہیں۔  
یہ کہہ کر ایکسٹرنل نے زور کی آواز دی۔ ”اے یاسین!  
اے او یاسین۔!“

لبے بالوں والا ایک دہلا پٹلا لڑکا کچن سے آٹا گوندھتا ہوا  
باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر ایکسٹرنل نے جلدی سے کہا۔  
”چائے بناؤ۔!“



گویا فلم انڈسٹری میں کبھی کوئی خالی نہیں ہوتا۔ اور ہوتا  
ہے تو صرف اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی کسی سے دام طلب کرتا  
ہے۔ اگر پروڈیوسر، فنانسر سے پیسے مانگے تو وہ خالی ہاتھ ہوتا ہے۔  
پروڈیوسر سے ایکسٹرنل مانگے تو پروڈیوسر خالی ہوتا ہے۔ ایکسٹرنل  
گیراج والا مانگے۔ تو وہ خالی ہوتا ہے۔ ہاتھ خالی جیب خالی  
بنک خالی۔ اس لئے بچو بچاؤ تالی۔ اور کہو۔  
خ سے خالی۔!

## ”د سے دل۔!“

فلم کی دنیا میں دل کی بیماری عام ہے۔ جسے دیکھو دل تھامے ہوئے گھوم رہا ہے۔۔۔ ہیر دے کہ دل پر ہاتھ رکھے ایسی ٹھنڈی آپہں بھرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس کے اندر دل کے بجائے ریفریجریٹر رکھا ہوا ہے۔ ہیر دین اپنے دل کا دکھڑا بیان کرتے ہوئے یوں رک رک کر سسکیاں لیتی ہے گویا اس نے پیپھڑوں میں ہچکیوں کی مشین لگا رکھی ہے۔ ولین ہے کہ اپنے گول گول دیدے گھما کر دانت پس کر اپنے چہرے کو انتہائی خوفناک بنا کر کچھ ایسے کرب ناک لہجہ میں اپنے دل کی تکلیف بیان کرتا ہے کہ گمان گزرتا ہے کہیں اسے دل کے بجائے اپنیڈیسا ٹر کا دورہ تو نہیں پڑا۔۔۔ وہ ناچنے والی ہے کہ تھکر تھکر کر کہتی ہے۔ ”دل دیکھو، دل دیکھو، دل دیکھو جی۔“ وہ شاعر ہے کہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتا ہے۔ ”دل تیرا دیوانہ، دل کی تمنا تھی مستی میں، تم کو پیا دل دیا، دل گیا سا جن کی نگری۔“

فلم کے نام بھی زیادہ تر دل پر رکھے جاتے ہیں۔ ”دل ہی

تو ہے ، دل ایک مندر ، ایک دل سوا فسانے ، پھر وہی دل لایا ہوں ۔ " قلمی دنیا میں جسے دیکھو دل کی بیماری میں مبتلا ہے ۔ مگر مرنا کوئی نہیں ۔ !

فلمی دنیا میں سب سے زیادہ مصیبت دل پر ڈھائی جاتی ہے۔ دل بیٹتا ہے۔ دل روتا ہے۔ دل زخم کھاتا ہے۔ دل سے دھوکا کیا جاتا ہے۔ دل چرایا جاتا ہے۔ دل پر ڈاکہ پڑتا ہے۔ دل میں ناسور ہوتا ہے۔ دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے رہتے ہیں۔ دل کی کلی کبھی نہیں کھلتی۔ اس کی کوئی آرزو بر نہیں آتی.....

دل نہ ہوا      پر ہی سیکشن کا کلرک ہوا۔

مگر مزے کی بات یہ ہے کہ اتنی مصیبتوں کے باوجود  
دل بول نہیں سکتا۔ فریاد نہیں کر سکتا۔ یہ فلمی دنیا کا  
قاعدہ ہے۔۔۔ دل پر لاکھ چھریاں چلیں۔ مگر دل پرسیں میں  
رپوٹ نہیں کر سکتا۔ دل کو دھوکے پر دھوکے دیئے جائیں،  
مگر وہ عدالت میں دعویٰ نہیں کر سکتا۔ دل میں تاسور ہو جائے مگر  
وہ کسی ڈاکٹر سے رجوع نہیں ہو سکتا، اس پر ڈاکہ پڑ جائے۔ مگر  
وہ ہمیشہ آچار یہ بھاؤ کی طرح معاف کرنے پر مجبور ہے۔  
عجیب احمق ہے یہ دل۔۔۔ مگر فلم کے سنار میں اس دل کے

بغیر گاڑی ایک اپنچ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس لئے اپنے دل پر ہاتھ رکھو اور کہو۔

د سے دل ..... !



”دھ سے دھالو۔ !“

فلمی ڈکشنری میں اس سے بڑا، اس سے طاقتور، اس سے جاندار اور کوئی کلمہ تعریف نہیں ہے۔ دھالو ہیں جو کسی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور صفحوں کے صفحے کالے کرتے ہیں۔ صرف ایک لفظ سے کام چل سکتا ہے۔ ”دھالو!“ فلم بنانے والے کی تعریف کرتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے صرف یہی ایک لفظ کہیے، سب بڑا پار ہے۔ !

فلم بنانے والا پوچھے۔ ”میرا ہیرو کیسا ہے۔؟“

فوراً جواب دیجئے۔ ”دھالو!“

”میری کہانی کیسی ہے۔؟“

”دھالو.....!“

”میری فلم کا نام کیسا ہے۔؟“

”دھالسو۔!“

”میرے ڈائریکٹر کا کام کیسا ہے۔؟“

”دھالسو۔!“

”میری نعل کا گلفام کیسا ہے۔؟“

”دھالسو۔!“

”شاباش۔۔۔ کل آکے کنٹرکٹ کر جاؤ۔!“

دیکھا آپ نے۔ یہ ہے لفظ ”دھالسو۔“ کا کمال !

ویسے ’دھ‘ سے دھولنس بھی ہے۔ مگر فلم کمپنی میں کسی کی دھولنس نہیں چلتی۔۔۔ ’دھ‘ سے دھرم بھی ہے۔ مگر فلم کمپنی میں وہ بھی نہیں چلتا۔ اس لئے یہ دونوں لفظ بھول جائیے۔ اور صرف یاد رکھیے۔

دھ سے دھالسو !



”ٹ سے ڈائریکٹر !“

”ٹ سے ڈائریکٹر ہوتا ہے۔ بلکہ ہوتا تھا۔۔۔ کیونکہ آجکل



ڈائریکٹر کے پاس ہونے کے لئے کچھ رد نہیں کیا ہے۔۔۔ پر انے  
 زمانے میں ڈائریکٹر فلم کی جان ہوا کرتا تھا۔۔۔ وہ کہانی کا انتخاب  
 کرتا تھا۔ اس کے مطابق ہیرو اور ہیروئن چن تا تھا۔ پھر باقی کیریئر  
 پھر کہانی کے مزاج کے مطابق سنگیت کار اور شاعر کا انتخاب کرتا تھا۔  
 اور اسی طرح فلم کے دوسرے شعبوں کو ملا کر ایک ایسی فلم بناتا تھا  
 جو اس کی شخصیت اور فن کی مکمل نمائندگی کر سکتی تھی۔۔۔ اس زمانے  
 ڈائریکٹر اپنی تصویر سے پہچانا جاتا تھا۔۔۔ لوگ کہتے تھے یہ  
 "آدمی" کا ڈائریکٹر ہے۔ یہ "آن" کا ڈائریکٹر ہے۔ یہ  
 "ستیا" کا ڈائریکٹر ہے۔۔۔ آج کل لوگ کہتے ہیں۔ یہ ولیپ  
 کمار کا ڈائریکٹر ہے۔ یہ دیو آنند کا، یہ جانی واکر کا.....!  
 پہلے زمانے میں ڈائریکٹر فلم کا خالق ہوتا تھا۔ آج کل  
 وہ محض پالک ہے۔۔۔ اگر ہم اپنی فلموں کو بہتر اور خوبصورت  
 بنانا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اپنی فلموں میں ڈائریکٹر کو اس کا مرکزی مقام  
 دینا پڑے گا۔۔۔ اور زور سے کہنا پڑیگا۔  
 دے سے ڈائریکٹر۔!

”دھ سے ڈھنڈورہ!“

اپنے بچپن کی بات کرتا ہوں۔ ہمارے محلے میں ایک ڈھنڈورہ پیٹنے والے آیا کرتے تھے۔ نام تھا سکھانند۔ دبلے تیلے لائے آدمی تھے۔ سر پر پٹے رکھتے تھے اور حیر سے پر بڑی بڑی خوفناک مونچھیں۔ مگر نہایت شریف آدمی تھے کسی کو دکھ نہ دیتے تھے۔ صرف کبھی کبھی ہمارے محلے میں گلے میں ڈھول ڈالے۔ ہاتھ میں گھنٹی لے۔ یا ڈگڈگی لے آتے تھے اور ڈھول بجا کر ڈگڈگی ہلا کر اپنی پاٹ دار آواز میں اعلان کرتے تھے۔

”آج شام کو۔۔۔ ساڑھے چھ بجے۔۔۔ موتی ہال میں۔۔۔ سوامی شرودھانند کا لیکچر ہوگا۔۔۔ گیتا کے ساتویں ادھیائے پر۔۔۔ ڈگ ڈگ ڈگ!“

جب ہم ذرا بڑے ہوئے تو یہی سکھانند اسی ڈھول اور ڈگڈگی کے ساتھ ہمارے محلے میں آکر ڈھنڈورا پیٹنے لگے۔

”آج شام کو۔۔۔ ساڑھے چھ بجے۔۔۔ موتی ہال

میں — مہاتما گاندھی کا لیکچر ہوگا — ہندوستان کی آزادی  
پر — ڈگ ڈگ ڈگ !

جب اور بڑے ہوئے۔ تو یہی سکھانند، ڈھول گھنٹہ  
ڈگڈگی لئے آئے — اور اسی پاٹ دار آواز میں مگر کسی قدر  
اداس لہجہ میں بولے۔

”آج شام کو — سارے چھ بجے — موتی سینما  
میں — مس مادھوری اور ای بلو موریہ کا لیکچر ہوگا — نام  
ہے — پریم کا ڈنڈا — ڈگ ڈگ ڈگ !“

اس کے بعد انہوں نے سر جھکا کر متبیلی برابر چھوٹے چھوٹے  
کاغذ باٹنا شروع کر دیئے۔ جس پر اسی لیکچر کی مزید تصریف لکھنی ہوئی  
تھی — میں نے پہلی بار دیکھا کہ ان کا چہرہ کچھ مرجھا گیا تھا۔  
جیسے وہ یکلخت بڑھے ہو گئے ہوں۔ !

پھر ایک دن میں نے دیکھا کہ ہمارے محلے کی دیواروں  
پر مکانوں پر اور ہر خالی جگہ پر بڑے بڑے رنگین کاغذ لگے ہوئے  
ہیں۔ جن پر ایک خوب صورت عورت کی تصویر ہے۔ جو اپنے کپڑوں

کے باوجود تستریباً ننگی نظر آرہی ہے۔ اور محلے کے بچے، جوان اور بوڑھے ان رنگین کاغذوں کے گرد اکٹھے ہو کر بڑی حیرت سے ان تصویروں کو دیکھ رہے ہیں۔ جس کے نیچے لکھا تھا۔

ہندوستان کا سب سے شاندار فلم  
آپ کے شہر کے سب سے شاندار سینما میں۔  
فلمی دنیا کی سب سے شاندار جوڑی کے ساتھ۔  
ڈی فتور اور مس ہچکولا۔  
پریم کے پھندے۔!

سارے دھندے چھوڑ کر دیکھئے۔ "پریم کے پھندے!"  
موتی سینما میں۔ ہر روز پانچ شو ہوں گے (جن میں تین میٹنی ہوں گے،  
پہلا میٹنی آٹھ سے گیارہ بجے صبح، دوسرا میٹنی بارہ بجے سے تین  
بجے دوپہر تک، تیسرا میٹنی سواتین سے سوا چھ بجے تک پھر  
ساڑھے چھ سے ساڑھے نو تک۔ پھر آخری شو ساڑھے نو سے ساڑھے  
بارہ بجے رات تک ہوگا۔)

(ایڈوانس بکنگ جاری ہے۔!)

میں جب یہ اشتہار پڑھ کر پیچھے ہٹا۔ تو مجھے سکھانند  
 نظر آئے۔ چھاتی پر ڈھول ٹٹکائے اور ہاتھ میں گھنٹہ لئے خاموش  
 کھڑے نظر آئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے! آج انہوں  
 نے محلے میں نہ گھنٹہ بجایا۔ نہ ڈھول۔ چپ چاپ اپنے آفسو  
 پیتے ہوئے خاموشی سے سر جھکا کے واپس چلے گئے۔  
 اس دن کے بعد میں نے سکھانند کو ڈھنڈورا پیٹتے  
 ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔

وہ ڈھنڈورا پیٹنے والے چلے گئے۔ جو صرف مطلب  
 کی بات بتاتے تھے اور بات کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ ناظرین پر  
 چھوڑ دیتے تھے۔ اب نئے ڈھنڈورچی آئے ہیں۔ ڈھنڈورا  
 یہ بھی پیٹتے ہیں۔ نام ان کا بھی سکھانند ہے۔ مگر ان کے گلے میں  
 نہ ڈھول ہے۔ نہ ہاتھ میں گھنٹہ ہے۔ نہ نعل میں ڈگڈگی ہے۔  
 —————! آجکل کے ڈھنڈورا پیٹنے والوں کے ہاتھ میں قلم  
 ہوتے ہیں۔ نعل میں دھسکی، کاغذ پر جھوٹ.....!  
 اس لئے بچو اگر فلم میں زندہ رہنا چاہتے ہو۔  
 تو ہمیشہ اپنا یا کسی دوسرے کا ڈھنڈورا ضرور



پیو اور کہو۔

”دھ سے ڈھنڈورا!“



”خ سے ذلت۔!“

کوٹھے پر ناچنے والی ذلیل سمجھی جاتی ہے۔۔۔ فلم میں  
ناچنے والی ذلیل نہیں سمجھی جاتی ہے۔؛ کوٹھے پر گانے والی بری  
سمجھی جاتی ہے۔ فلم میں گانے والی عزت پاتی ہے۔!  
پرائیویٹ محفلوں میں حسن کا مظاہرہ کرنے والی ادبائش  
مافی جاتی ہے۔۔۔ فلم میں جنس کا مضبوط اظہار کرنے والی اداکار  
کہلاتی ہے۔

زندگی کے دوسرے شعبوں میں میرے یا آپ ایسا انسان  
کئی بار ذلت محسوس کرتا ہے۔ اگر کوئی مجھے گالی دے تو ذلت کا احساس  
ہوگا۔۔۔ میں کسی سے وعدہ کر کے مکر جاؤں، تو لوگ مجھے ذلیل  
سمجھیں گے۔ کسی سے قرضہ لے کے پھر جاؤں یا لوگوں کے

لاکھوں لے کے دیوالیہ ہو جاؤں تو لوگ مجھے ذلیل سمجھیں گے۔ مگر فلمی دنیا میں سب کچھ شب و روز ہوتا رہتا ہے۔ پھر بھی کوئی ذلیل نہیں ہوتا۔ کیونکہ فلم انڈسٹری میں سب کچھ ہوتا ہے۔ صرف ذلت کا نقطہ ہی نہیں ہوتا۔ !

مگر میں نے غلط کہا — فلمی دنیا میں بھی ذلت ہوتی ہے۔ ! مثال کے طور پر اگر آپ کوئی ایسی تصویر بنائیں جو صاف ستھری اور با مقصد ہو۔ جس میں انسان کی برائی۔ زندگی کی اچھائی اور کائنات کی دلربائی کے عناصر کا اظہار ہو۔ تو آپ انتہائی ذلیل و خوار ہوں گے۔ ! اخبار والے آپ کے خلاف لکھیں گے کیونکہ وہ ہر اچھے مقصد کو پراسپیکٹ اسمتھتے ہیں۔ ! آپ کی مسلم خریدنے والا اسے کسی سٹورڈ کلاس کچیراؤس میں چلائے گا۔ کیونکہ آپ نے بڑے بڑے ستارے نہیں لئے۔ ! پبلک آپ کی تصویر کو رد کر دے گی۔ کیونکہ آپ نے وہ سبکیں اور گلیسر نہیں دیا جس کی وہ عادی ہو چکی ہے۔ ! آپ اپنی ساری پونجی کھودیں گے۔ اور دونوں خالی جیبیں جھاڑتے ہوئے یہ کہتے ہوئے فلم انڈسٹری سے باہر نکل آئیے گا۔

”بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے ؟“

اس لئے اگر ذلت سے بچنا چاہتے ہو۔ تو ہر طرح کی ذلت  
کے لئے تیار رہو۔ اور کہو۔  
ذ سے ذلت !



”ر سے رومالٹس۔ !“

رومالٹس ہر فلم میں ہوتا ہے۔ اور جس فلم میں رومالٹس نہیں  
ہوتا اسے ہم ڈوکیومنٹری کہتے ہیں۔ ڈوکیومنٹری میں عام پریڈروں کے  
بھیانک چہرے ہوتے ہیں۔ اور ان کی لمبی لمبی تقریریں۔ یا ان میں مچھڑ  
مارنے سے لے کر پرانا کر نے تک کے طریقے بتائے جاتے ہیں، اور  
اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ڈوکیومنٹری میں کسی طرح کی  
کوئی دلچسپی نہ آنے پائے۔ عام طور پر لوگ ڈوکیومنٹری کو آنکھ بند  
کر کے دیکھتے ہیں۔ ڈوکیومنٹری دیکھنے کا سب سے اچھا طریقہ یہی  
ہے۔ !

مگر رومالٹس کی بات اور ہے۔ رومالٹس آنے ہی تماشا بھوں  
کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ دل بھی کھلنے لگتا ہے۔ فلم دیکھنے والی ہر لڑکی

دل ہی دل میں اسکرین پر نظر آنے والے مہیرو کو چاہئے لگتی ہے۔ اور فلم دیکھنے والے مرد مہیروین کی ہر ادھر لوٹ لوٹ جاتے ہیں۔ جس فلم میں جتنی زیادہ کامیابی سے یہ عمل ہوتا ہے۔ وہ فلم اتنی ہی کامیاب ہوتی ہے۔

رومانس کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک لڑکی ہونے بصورت اور ایک لڑکا ہو وہ بھی خوب صورت ہو۔ لڑکے اور لڑکی دونوں کا ہی خوب صورت ہونا بہت ضروری ہے۔ زندگی میں بد صورت لڑکے اور لڑکیاں ہی رومانس کرتے ہوں گے۔ مگر فلم میں نہیں کرتے۔ فلمی رومانس تین طرح کا ہوتا ہے۔

(۱) پنجابی رومانس — اس رومانس میں لڑکا لڑکی دونوں

زیادہ تر اپنے ہاتھوں کا استعمال کرتے ہیں۔ لڑکا لڑکی کو دیکھ کر گھوڑنا ہے۔ پھر اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے قریب لاتا ہے۔ لڑکی غصے میں آکر تڑپے ایک طمانچہ لڑکے کے منہ پر مارتی ہے۔ لڑکا زور سے اس کی پیٹھ میں گھونسا مارتا ہے۔ لڑکی چیل نکال لیتی ہے۔ دونوں لڑتے لڑتے گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ اور رومانس ہو جاتا ہے۔

(۲) بنگالی رومانس — اس میں باتوں کے بجائے آنکھوں

سے کام لیا جاتا ہے۔ اس رومانس میں خاص بات یہ ہے کہ نہ لڑکا پوری

تصویر کے دوران لڑکی کو چھوٹا ہے۔ نہ لڑکی لڑکے کو چھوٹی ہے۔ بس دونوں قریب یا نزدیک سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں اور دھیرے دھیرے روتے رہتے ہیں۔

(۳) بمبیا رومالش — اس میں ہاتھوں اور آنکھوں کے بجائے ٹانگوں سے کام لیا جاتا ہے۔ چست کپڑے پہن کر جاز کی دھن پر کوہے ٹمکائے جاتے ہیں۔ جو جوڑا زیادہ سے زیادہ دیر تک کوہے ٹمکائے سکے وہ سمجھو رومالش کا جوڑا ہے۔

فلمی رومالش میں یہ ضرور ہی ہے کہ اگر لڑکا امیر ہے تو لڑکی غریب ہو۔ لڑکا غریب ہے تو لڑکی امیر ہو۔ امیر کا امیر سے اور غریب کا غریب سے رومالش کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دراصل فلم والے اس طریقہ سے امیر اور غریب میں ملاپ کرنا چاہتے ہیں۔ اور منہیں جانتے کہ اگر فلم والوں کے کہنے میں آکر چند ہزار امیر لڑکے غریب لڑکیوں سے شادی کر بھی لیں تو باقی کروڑوں غریب لڑکے لڑکیوں کا کیا ہوگا۔

جب تک اس مسئلے کا کوئی حل دریافت ہوتا ہے۔ آپ بھی فلمی رومالش کیجئے۔ اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے۔

میرے رومالش !



## ”ڑ سے جھگڑا۔“

بچو ڑ سے کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا۔ ڑ کا حرف ہمیشہ کسی لفظ کے بیچ میں پایا جاتا ہے۔ جیسے جھگڑا جسے بمبیا زبان میں لفظا کہتے ہیں۔ (دونوں لفظوں میں ”ڑ“ موجود ہے)

”ڑ“ جھگڑے کے بیچ میں موجود ہے۔ اور جھگڑا بھی کسی دو افراد کے بیچ میں ہوتا ہے۔ بھلا کوئی اکیلا کس سے جھگڑے گا؟ جھگڑنے کے لئے دو یا دو سے زیادہ افراد کا ہونا ضروری ہے۔ فلم میں بھی جھگڑا ہوتا ہے، مار پٹائی ہوتی ہے، گھولنے بازی ہوتی ہے۔ مگر اس سے کسی کو چوٹ نہیں پہونچتی خون نہیں نکلتا صرف لال روشنائی بہتی ہے۔ اور گھولنے چہرہ سے ایک اپنچ دور رہتا ہے اور پستول بھی اگر چلتا ہے تو اس میں کارٹوس کے بجائے پٹاخہ ہوتا ہے۔ یہ فلمی جھگڑا جو فلم میں اس قدر خوفناک دکھائی دیتا ہے۔ اصل میں بہت ہی معصوم اور سبھالا سا ہوتا ہے۔ اس لئے بُرے مزے اور اطمینان سے اس جھگڑے کو دیکھو۔

اور کہو۔ ڑ سے جھگڑا۔ !

## ”زندگی سے زندگی۔“

ہماری زندگی جیسے کہ آجکل چلتی ہے یا چلائی جاتی ہے اس زندگی سے بہت مختلف ہے جو فلم میں دکھائی جاتی ہے۔ فلم میں ایک مزدور کی لڑکی بھی ڈھائی سو کی ساڑھی پہنے ڈیڑھ سو کا میک اپ کئے ناچتی نظر آتی ہے۔ حقیقت میں اسے زندگی بھر پچاس کی ساڑھی نصیب نہیں ہوئی۔ فلم میں ایک ٹل کلاس گھر کا جو ڈرائنگ روم پیش کیا جاتا ہے۔ اسے اگر ایک ٹل کلاس آدمی خریدنا چاہے تو اس کی دو برس کی آمدن صرف ہو جائے۔ فلم میں جس طرح ایک ہیرو پچاس آدمیوں کو مار بھگاتا ہے۔ اسی تکنیک پر عمل کرتے ہوئے میں نے بھی ایک دفعہ اپنے دشمنوں کو مار بھگانے کی کوشش کی نتیجہ میں میری وہ ٹپائی ہوئی کہ دونوں بازوؤں کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور تین مہینے ہسپتال میں رہنا پڑا۔

اسی طرح میں نے ایک بار فلم دکھی تھی جس میں ہیرو اور ہیروئن کی ملاقات بس کے اڈہ پر ہوئی ہے۔ ہیرو پہلے سے بس کے اڈہ پر کھڑا ہے اتنے میں ایک نہایت خوبصورت لڑکی آتی

ہے اور کیو میں سپر کے بعد آ کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں بارش ہونے لگتی ہے۔ سپر فوراً چھاتا کھول کر سپر دین کے سر پر رکھتا ہے۔ سپر دین مسکرا کر سپر کے چھاتے میں آ جاتی ہے۔ اور بس — محبت ہو جاتی ہے۔

مجھے یہ نظر اس قدر پسند آیا کہ اسے دیکھنے کے بعد میں ہینول چھاتا لے کر بس کے اڈوں پر گھومتا رہا۔ مگر اول تو مجھے کوئی خوبصورت لڑکی کی نظر نہیں آئی اور کبھی نظر بھی آئی تو اس کے پاس خود ایک چھاتا تھا — یا شوہر تھا۔ اور اگر دونوں میں سے کچھ نہ تھا تو کمبخت بارش نہ ہوئی۔

مگر ایک بار قسمت نے یاوری کی اس دن بس سٹاپ بھی تھا۔ میں بھی تھا ایک خوبصورت لڑکی بھی تھی اور بارش بھی آگئی۔ میں بے حد خوش ہوا۔ فوراً چھاتا لے کر خوبصورت لڑکی کی طرف مسکراتا ہوا بڑھا۔ لڑکی نے شرمناک چھاتا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور جلدی سے دوڑ کر چلتی بس میں سوار ہو گئی۔

لیجئے چھاتا بھی گیا، لڑکی بھی گئی۔ اور میں بارش میں بھیگتا کھڑا رہ گیا۔

زندگی اور ہے فلم اور ہے۔ جس طرح ہاتھی کے دانت

کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور ہوتے ہیں ! ہمارے  
عہد میں ہمارے ملک میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو فلم میں  
اصلی زندگی نہیں دیکھنا چاہتے۔ کیونکہ وہ بہت بھیاٹک ہے۔  
وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ "چند" جھوٹے سہانے سینے، چند خوب صورت  
فریب، چمکتے ہوئے دھوکے جو ان کو چند لمحوں کے لئے تلی دے سکیں۔  
اس کے بعد — وہ جانتے ہیں پھر وہی زندگی ہوگی وہی اس  
کی تلخیاں اور مجبوریاں ہوں گی۔

اور وہی زندگی زیاں سے معمور۔  
نہ سے زندگی۔ !



"ڈال سے ڈال" (نام پہلوان کا)

ڈال نام پہلوان کا ہوتا ہے — آپ پوچھیں گے کہ  
پہلوان کا فلم سے کیا تعلق ؟  
کچھ عرصہ پہلے واقعی کسی قسم کا تعلق نہیں تھا —  
زیادہ یہ ہوتا تھا کہ کسی فلم کے کسی حصہ میں دو پہلوان کی کشتی

دکھا دی جاتی تھی۔ مگر اب تو فلم انڈسٹری میں چاروں طرف پہلوان ہی پہلوان نظر آتے ہیں۔ !

پہلے فلم والے خوب صورت چہروں اور چاکلیٹ ٹائپ کے ہیرو کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ آجکل وہ پہلوان کو ڈھونڈھتے ہیں۔

چنانچہ آجکل جوق در جوق ہندوستان کے مختلف گوشوں سے پہلوان آکر فلم انڈسٹری میں ہیرو بن رہے ہیں۔ کشتیاں لڑکر جتنا وہ ساری زندگی میں کما سکتے تھے۔ آجکل وہ صرف ایک فلم سے کما لیتے ہیں۔

پہلے فلم انڈسٹری میں صرف خوبصورت اور دیدہ زیب نوجوانوں کی کھپت تھی۔ اب اگر آپ بد صورت ہیں۔ آواز بُری پائی ہے۔ اکیٹنگ نہیں کر سکتے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ کا پہلوان ہونا کافی ہے۔ !

عام طور پر نئے چہروں کو فلم کے دوران میں بہت ڈانٹا جاتا ہے کیونکہ بے چارے نا تجربہ کار ہوتے ہیں لیکن نا تجربہ کار سے نا تجربہ کار پہلوان کو بھی کوئی نہیں ڈانٹ سکتا۔ میں ایک دوست پنجاہی پہلوان کو جانتا ہوں جسے فلم کے دوران مندرجہ



ذیل مکالمہ یاد کرنے کے لئے دیا گیا۔

”کیا کہا؟ شہزادہ شہزادی کو لے کے بھاگ گیا۔؟“

پہلوان نے اچھی طرح سے یاد کرنے کے اس مکالمہ کو رٹ

لیا۔ جب رٹ لیا۔ تو اس نے ڈائریکٹر سے کہا۔ کیمرا چلاؤ۔ جب

کیمرا چلنے لگا تو ڈائریکٹر نے پہلوان کو بولنے کا اشارہ کیا۔ پہلے

تو پہلوان نے اپنے سینے کو پھلایا۔ پھر اپنے دونوں بازوؤں کی

مچھلیاں گھمائیں۔ پھر گرج کر بولا۔

”کی کہا۔؟ شہزادہ شہزادی نوں لے کے بھاگ گیا۔؟“

Cut ”کٹ“ ڈائریکٹر زور سے چلایا۔

پہلوان نے گھور کر ڈائریکٹر کی طرف دیکھا۔ دونوں

ہاتھوں کی مٹھیاں بند کیں اور دھیرے دھیرے ڈائریکٹر کی طرف

بڑھتے ہوئے بولا۔

”کی کہا۔؟ گلط ہے۔؟“

”جی نہیں۔ ڈائریکٹر کانپ کر بولا۔ شاٹ اکدم اوکے

ہے۔“

آنجل پہلوان کی چاندی ہے۔ ڈائریکٹر سیٹ پر کچھ

نہیں کہہ سکتا۔

پر دوڑو سر پیہ نہیں روک سکتا۔ انکم ٹکیں کا انشپکٹر  
تک قریب آتے ہوئے ڈرتا ہے۔

اس لئے اگر آپ پہلوان ہیں تو فوراً لنگوٹ باندھ کر فلم  
کے میدان میں اتر آئیے اور دان پر ہاتھ مار کر لٹکائیے۔  
"تھ سے ڈال۔"

(پہلوان کا نام)



"سن سے سینما۔"

اگر آپ کی محبوبہ آپ سے کہے۔ میں ساڑھے پانچ بجے  
فلاں جگہ پر آپ سے ملوں گی۔ تو اس جگہ پر ضرور کوئی سینما ہال ہوگا۔  
اگر وہ یہ کہے مجھے گھسے آکر لے جانا اور دو ٹکٹ بھی  
ساتھ لیتے آنا۔ تو سمجھ لیجئے کہ اس نے سینما کے دو ٹکٹ منگوائے  
ہیں۔ میں ایک دفعہ غلطی سے ریلوے پلیٹ فارم کے دو ٹکٹ  
لیتا گیا۔ بڑا گھپلا ہوا۔

اگر کسی ہال کے باہر جگہ گاتی روشنیوں اور ادھ منگی

عورتوں کے پوسٹر کے نیچے تنگ مہری کی پتلون پہنے ہوئے لڑکے اور سچی ہوئی لڑکیاں سر پہ بالوں کی ٹوکری کی طرح اوپر اٹھائے ہوئے نظر آئیں۔ فوراً سمجھ جائیے کہ یہ ایک سینما ہال ہے۔

سینما ہال میں بیک وقت دو فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ ایک فلم پردے پر چلتی ہے۔ دوسری ہال کی سیٹوں پر چلتی رہتی ہے۔ دونوں فلموں کے لئے اندھیرا شد ضروری ہے۔

س سے سلور جہلی بھی ہے۔ جب کوئی فلم ایک ہی سینما میں متواتر پچیس ہفتے چلتی رہتی ہے۔ تو سلور جہلی مناتی ہے۔ یعنی چاندی کی جہلی..... ایسے موقع پر جہلی تو فلم دیکھنے والوں کو ملتی ہے اور چاندی فلم دکھانے والوں کے ہاتھ آتی ہے۔

س اسٹوڈیو بھی ہے۔ جہاں فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ فلم بنانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی سینما سے کوئی امریکی تصویر دیکھ آئیے۔ اور اسٹوڈیو میں آکر اسے بگاڑنا شروع کر دیجئے۔ بگاڑتے بگاڑتے ہندوستانی فلم بن جائے گی۔

س سے اسکول بھی ہے۔ جہاں کسی زمانہ میں لڑکے پڑھنے کے لئے جاتے تھے۔ آجکل وہ سینما جاتے ہیں۔ اور اسکول میں بیٹھے بیٹھے خالی بچوں سے لکھیاں اڑاتے ہیں۔

اگر آپ کا لڑکا بھاگ گیا ہے۔ تو اس کے لئے پولیس اسٹیشن  
جائے کی ضرورت نہیں ہے۔ فوراً ٹکٹ کٹ کر بھئی آ جائیے۔ آپ کا لڑکا  
آپ کو ضرور کسی اسٹوڈیو کے اندر یا باہر حکم دگاتا ہوا مل جائے گا۔  
اس کے بعد آپ اپنے کان پکڑیے اور کہیے۔  
س سے سینما۔ !



”س سے شاعر۔ !“

فلمی شاعر۔ ادبی شاعر سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ مثال  
کے طور پر ادبی شاعر گیت کہتا ہے۔ فلمی شاعر گیت لکھتا ہے۔ بلکہ اکثر  
ٹھوکتا ہے۔ جس طرح لوگ دیوار میں کیل ٹھوکتے ہیں۔

ساعر سبائی ایسا گیت ٹھوکتا۔ ایسا گیت ٹھوکتا کہ سالا لوگ  
”چل چل رے نوجوان۔“ ہی بھول جائیں۔ (فلمی ڈائریکٹر کا تقاضہ)

ادبی شاعر کہتا ہے۔ فلمی شاعر شعر لکھتا ہے۔ جس کی سطر میں

موسیقار (میوزک ڈائریکٹر) کی مرضی کے مطابق چھوٹی بڑی کر دی  
جاتی ہیں۔ شاعر نے گیت کی سطر میں یوں لکھیں۔ ”وہ نیگھٹ پر آئے“

..... اب موسیقار نے گنگنا نا شروع کیا۔

وہ ننگھٹ پر آئے ..... وہ ننگھٹ پر آئے، ہائے۔  
دیکھئے لفظ "ہائے" اس دھن میں کیسا فٹ بٹھا ہے۔ ڈائریکٹر  
نے کہا۔

"تو رگتا دو تا جی" ہائے "اس کے ساتھ ہی ساغر بھائی۔"  
اور ساغر بھائی نے دست بستہ عرض کیا۔ "بجا ارشاد۔"  
وہ ننگھٹ پر آئے، ہائے ہائے۔

"لفظ ہائے اگر تین دفعہ آجائے تو لطفت دو بالا ہو جائے۔"  
دو بالا۔ میوزک ڈائریکٹر نے کہا۔ — ڈائریکٹر بولا — "ساعر  
بھائی اس کو جلدی سے میوزک ڈائریکٹر کی مافق دہلا دو بالا، نہاؤ۔"

اب گیت کی سطر میں یوں ہو گئیں — وہ ننگھٹ پر

آئے، ہائے، ہائے، ہائے۔ موسیقار نے پھر گنگنا نا شروع کیا.....

وہ ننگھٹ پر آئے۔ ہائے، ہائے، ہائے۔ ہارمونیم لیکر بیٹھے اور ڈائریکٹر  
سے اس دھن کے بارے میں پوچھا۔ "کیسی رہے گی دھن؟"

ڈائریکٹر نے کہا۔ "سالی دھن جیتی نہیں۔"

اس فلمی دنیا میں ڈائریکٹر کو کوئی چیز نہیں جیتی۔ نہ پکچر، نہ

ڈانس، نہ گانا، نہ مکالمے، "سالا کچھ جتا نہیں — یہ گانا۔"



اس میں ادھم نہیں۔ جب تک پکیر ہاؤس میں پاؤں سے کھٹا کھٹ  
تال نہ دیں۔ یہ گانا بندل رہے گا۔ سمجھے غلام صابر۔؟

غلام صابر نے پھر گنگنا نا شروع کیا۔

وہ ننگھٹ ..... وہ ننگھٹ

شاعر نے لقمہ دیا — "وہ نٹ کھٹ ..... وہ نٹ

کھٹ ....."

ڈائریکٹر نے اصلاح دی۔ "وہ جھٹ پٹ، وہ جھٹ

پٹ۔"

"وہ نٹ کھٹ، جھٹ پٹ، ننگھٹ پر اے — ہاے

ہاے ہاے۔"

شاعر نے اچھل کر کہا گیت ہو گیا۔ ہو گیا۔ ہو گیا۔

ڈائریکٹر نے شاعر کو گلے لگا کر کہا۔ "ہاں ہو گیا تو بڑا

سالا سا عرب ہے۔ تو مہاکوی تلمیسی واس ہے۔ مہاکوی کالی واس ہے۔

مہاکوی مدھوک، مہاکوی پردیپ اور مہاکوی پادھیہا ہے....."

جنہوں نے چور بازار اور چنڈ و باز کے گانے لکھے ہیں۔ تو ان سے بھی

بڑھ کر ہے۔ اور تو جوس (جوش)، اور مجاج (مجاز) کا بھی باپ ہے۔

وہ تیرے اوپر کیا گانا لکھیں گے۔ نے یہ چوٹی اور پانی پوری کھالے

بجاء بازار سے ۔

شاعر اردو کا ہوتا شاعر اعظم کہلاتا ہے ۔ ہندی کا ہوتا  
مہاکوی ۔ لیکن مہاکوی ہو یا شاعر اعظم دونوں کی زبان ایک ہوتی  
ہے ۔ چاہے وہ دوہا ہو، گیت ہو، کجلی ہو، یا فوالی ۔ فلمی گیت  
میں اگر چاند، پیپا، ندیا، برہما، جیا، تڑپائے، جل جائے،  
اگنی، لوفان، منجد ہار، بقیسرا کا ذکر نہرا بار نہ ہوتا وہ فلمی گیت  
کبھی پاس نہیں ہوتا ۔ تبدیل ہو جاتا ہے ۔ ادبی شاعر کے گیت سمجھے  
جاتے ہیں ۔ فلمی شاعر کے گیت تو نہیں ۔ البتہ ان کی دھنیں ضرور  
سمجھی جاتی ہیں ۔ اسی لئے وہ لکھے جاتے ہیں ۔ معنی اور مطلب سے  
انہیں کوئی واسطہ نہیں ۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ جتنا مہمل  
ہوگا ۔ موسیقار اس کی دھن اتنی ہی زیادہ اچھی بنائے گا ۔ اس لئے  
فلمی شاعر وہی کامیاب ہو سکتا ہے ۔ ”جو صرف“ ڈواں، ڈواں،  
ڈواں ” پر فضا عت کرے ۔

فلمی گیتوں کی اصلاح کا خیال دل سے نکال دیجئے ۔

منہیں تو خود اسٹوڈیو سے کپڑے پھاڑ کر نکل جائیے ۔

ادبی شاعر کی طرح فلمی شاعر بھی تخلص رکھتا ہے ۔ جیسے

آہ، واہ، ہا ہا، اور اگر منہسی سے زیادہ زور پکڑا ہوتا ہا ہا ۔ اس کے

علاوہ آج کل ٹیکنی کلر فلم کی مناسبت سے شاعروں نے اپنے تخلص  
 میں مختلف رنگوں کا استعمال بھی شروع کر دیا ہے۔ جیسے: نارنجی، اور  
 اوداگری، بابا عالم سیاہ پوش۔ محمد احمد سبزواری۔ پیلا پیلا۔  
 سرخ یا سرخا۔ پیلی بھتی۔ وغیرہ وغیرہ



### ”ص سے صندوق“

گھسروں میں جو صندوق ہوتے ہیں۔ ان میں کپڑے پڑے  
 رہتے ہیں۔ فلم میں جو صندوق ہوتے ہیں۔ ان میں فلم کے ڈبے پڑے  
 رہتے ہیں۔ یا میک اپ کا سامان پڑا رہتا ہے۔

فلم میں ایک صندوق جادو کا صندوق ہوتا ہے جسے  
 کھولتے ہی اس میں سے جادو کا جن نکلتا ہے۔ یا کوئی خوبصورت لڑکی  
 نکلتی ہے یا کانا ناگ نکلتا ہے۔

مگر فلمی دنیا میں سب سے قیمتی صندوق فلم فنانسر کا ہوتا  
 ہے۔ فنانسر انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ مگر فلم والوں نے فلم کے  
 ساتھ فنانسر کے لفظ کو بھی اپنی ڈکشنری میں داخل کر لیا ہے۔

صرف معنی بدل گئے ہیں۔

انگریزی زبان میں فنانسراں آدمی کو کہتے ہیں جو پیسہ لگاتا ہے۔ ہمارے فنانسراں آدمی کو کہتے ہیں جو پیسہ نہیں لگاتا ہے۔ آپ پوچھیں گے یہ کیسے ممکن ہے؟ پیسہ نہ لگائے بغیر آدمی فلم کا فنانسر کیسے بن سکتا ہے؟

معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ اور مشکل ہے۔ مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ مگر میں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ معاملہ حساب کا ہے ذرا غور سے سنو بچو — !

فرض کر لیجئے کہ آپ کے پاس وہ جادو کا صندوق ہے جس میں کالے سفید بازار کے نوٹ بھرے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آپ کے صندوق میں نوٹ بھرے ہوئے ہوں اگر بازار میں اس کی شہرت ہے کہ آپ نوٹوں سے بھرا ہوا صندوق رکھتے ہیں۔ (چاہے اندر سے وہ صندوق خالی ہی کیوں نہ ہو) بس فلم فنانسر بننے کے لئے یہی شہرت کافی ہے۔

اگر بازار میں آپ کا نام ہے۔ اگر لوگ جانتے ہیں کہ آپ لکھ پتی ہیں۔ تو آپ فوراً فلم فنانسر بن سکتے ہیں اور کسی پڑوسی سے "لکھت پڑھت" کر کے کسی فلم کے تمام ارضی و آسمانی حقوق

خرید سکتے ہیں۔ ایسے حقوق خریدنے والے کو فلمی اصطلاح میں "ورلڈ رائٹ کنٹرولر" کہا جاتا ہے۔

جو نہی آپ کنٹرولر بن گئے فلم پروڈیوسر اخباروں میں اپنی فلم کا اشتہار دیتا ہے۔ اس اشتہار کو دیکھتے ہی پروڈیوسر کے پاس دھڑا دھڑا بڑے بڑے ڈسٹری بیوٹر یعنی فلم تقسیم کرنے والوں کے آفر آنے لگتے ہیں۔ وہ لوگ فلم کے بڑے ستارے اور فلم کے بڑے فنانشر کا بڑا نام دیکھ کر پروڈیوسر کو ایڈوائس چیک بھی دے جاتے ہیں۔ اور فلم اپنے لئے ریزرو کر جاتے ہیں۔ مگر یہ روپیہ ایڈوائس کا پروڈیوسر کی جیب میں نہیں جاتا ہے۔ فنانشر کے صندوق میں جاتا ہے۔

فرض کر لیجئے کہ ایڈوائس میں دو لاکھ روپیہ آیا۔ اب فنانشر یہ دو لاکھ روپیہ (جو اس نے نہیں لگایا) فرض پر پروڈیوسر کو دیدیتا ہے۔ قرعہ کی شرائط بہت آسان ہیں۔ دو لاکھ پر نو فی صدی سود (کہ اس سے زیادہ گورنمنٹ کی اجازت نہیں)

دو لاکھ پر رائٹس بارہ فی صدی کے حساب سے —  
دو لاکھ پر نو فی صدی دلال کمیشن (دلال بھی فنانشر



خود ہوتا ہے۔

دو لاکھ پراڈور رائیٹرنگ کمیشن — ڈونی عیدی! یہ کل ملا کے خود اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔ اور یقیناً ڈیڑھ لاکھ وہ فلم پر وڈیوسر کے حوالہ کرتا ہے۔ جس سے فلم بننا شروع ہو جاتی ہے۔ بیچ میں اگر فلم رک جاتی ہے تو فنا لنسر ٹری خوش دلی سے وہ پچاس ہزار بھی جو اس سے پہلے کاٹ لیا تھا۔ اب بطور قرض پر وڈیوسر کے حوالہ کرتا ہے۔ اسی پچیس فی عیدی سود پر جس کا حساب میں اد پر بیان کر چکا ہوں۔

اس کے علاوہ اور بھی شرائط ہوتی ہیں۔ پر وڈیوسر اور فنا لنسر کے درمیان — بالعموم فنا لنسر منافع میں سے پچاس فیصدی کا حقدار ہوتا ہے۔ یہ ہو گیا پچھتر فیصدی — پھر ادور فلو — Overflow میں سے بھی خاصی رقم پیٹ لیتا ہے۔ کل ملا کے جب پر وڈیوسر آخر میں حساب کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ منافع تو فنا لنسر کے عندوق میں گیا اور اس کے حصہ میں گھٹا آیا ہے۔

سات لاکھ کا۔ !

سات لاکھ کا۔ !

تب وہ سر کھجا کر بڑی حسرت سے فنانشر کے  
 صندوق کی طرف دیکھتا ہے۔  
 اور — کہتا ہے۔  
 ”میں سے صندوق۔“



”میں سے صندوق“

پروڈیوسر پہلی فلم تو منافع کے لئے بناتا ہے۔ دوسری  
 فلم پہلی کا گھاٹا اتارنے کیلئے — تیسری پہلی دو فلموں کا قرضہ  
 اتارنے کے لئے اور اس طرح وہ صندوق میں ایک کے بعد دوسری فلم  
 بنائے چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس پر پچیس تیس لاکھ کا قرضہ ہو جاتا  
 ہے — تب وہ دلو الیہ ہو جاتا ہے۔ اور کیڑے جھاڑ کر فلم لایا  
 سے الگ ہو جاتا ہے۔

سبھی فنانشر بڑے نہیں ہوتے، سبھی پروڈیوسر گھائے

میں نہیں رہتے۔ مگر کامیابی اور ناکامیابی کی شرح ایک اور چار  
 لکھی ہے۔ ایک فلم کامیاب ہوتی ہے تو چار نہیں۔ ایک آدمی  
 لکھ پتی ہوتا ہے۔ تو چار لکھ پتی دیوالیہ ہوتے ہیں۔  
 میں تو کہتا ہوں کہ فلم میں کام کرنے والے لوگ بڑے  
 بہادر اور جیالے ہوتے ہیں۔ جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہند  
 میں آکر فلمیں بناتے چلے جا رہے ہیں۔

”غص سے ضد۔“



”ط سے طمانچہ۔“

فلم چلانے کے لئے طمانچہ کی اکثر ضرورت پڑتی ہے۔  
 جب فلم چلتے چلتے بور کرنے لگتی ہے۔ تماشائی اکتانے لگتے ہیں۔  
 یا اونگھنے لگتے ہیں۔ اس وقت ہیرو ولن ہیرو کے یا ہیروئن

ہیسرو کے تڑسے طمانچہ مار دیتی ہے۔ اور کہانی آگے چلنے لگتی ہے۔  
طمانچہ اتنے زور کا ہوتا ہے کہ اونگھنے والے تما شائی بھی جاگ اٹھتے  
ہیں۔ !

خاص کر گھسریو فلموں میں طمانچہ بہت کام میں آتا ہے۔  
فرصت کر لیجئے گھر کے سب لوگ بیٹھے ہیں۔ بھائی بہن ساس دہن  
باپ یا ہیسرو۔ بیٹھی بیٹھی باتیں ہو رہی ہیں۔ تما شائی بھائی لینے  
لگتے ہیں۔

کیونکہ اس سین میں کیا مزا ہے۔ بس تڑسے ایک طمانچہ  
ساس دہن کے یا دہن ساس کے مار دیتی ہے۔ اور کہانی آگے چلنے  
لگتی ہے۔ آگے جا کر جب پھر کہانی رکنے لگتی ہے۔ تو ہیسرو  
اپنے باپ کو طمانچہ مار دیتا ہے۔ اور کہانی پھر چلنے لگتی ہے۔  
اکثر دیکھا گیا ہے کہ فمیلی بچپن کی کہانی طمانچہ کے سہارے  
نہی چلتی ہے۔ کئی تصویروں میں تو ایک دو طمانچوں کے بجائے  
چھ سات آٹھ طمانچے مارے جاتے ہیں۔ جہاں کہانی بور محسوس  
ہونے لگی وہیں طمانچہ پڑ گیا۔ اسی طرح طمانچہ کھا کھا کے  
کہانی آگے چلتی ہے۔

اور جب طمانچہ سے کام نہ چلے تو طوفان آ جاتا ہے کیونکہ

طوفان بھی "ط سے ہے۔ ذہنی اور جذباتی طوفان سے کام نہ چلے تو سچ مچ کا طوفان آتا ہے۔ یاد دل کر رکھتے ہیں۔ بجلی چمکتی ہے۔ بارشیں موسلا دھار برستی ہیں۔ ایسے میں ہیرو یا ہیروئن کسی کا ایکسیڈنٹ لازمی ہے۔ کوئی نہ کوئی زخمی ہو جاتا ہے۔ اور کہانی آگے کو روانہ ہو جاتی ہے۔

اکثر فلموں میں اسی طرح دھکے دے دیکر کہانی کو اختتام تک پہنچایا جاتا ہے۔

آپ بھی تو ایسی فلمیں بڑے شوق سے دیکھتے ہیں اس لئے ماروا اپنے منہ پر طمانچہ۔  
اور کہو۔

"ط سے طمانچہ۔"





”ظ سے ظالم۔!“

ہر نسلم میں ایک ظالم ہوتا ہے۔ اور ظالم کے بغیر  
کوئی قلم نہیں بنتی۔

ظالم کو قلم والے اپنی اصطلاح میں ولن کہتے ہیں۔  
ولن کا مفصل بیان ’و‘ میں آئے گا۔ جب تک امت  
یاد رکھو۔

”ظ سے ظالم۔!“



## ”ع سے عقل“

بچو! عقل اس کو کہتے ہیں جس کی فلم نبانے میں ضرورت نہیں پڑتی۔ ورنہ ہر عقل والا فلم کا دھندا شروع کر لیتا اور لاکھوں کما لیتا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ فلم میں عقل دنگاتے ہیں۔ ناکام رہتے ہیں۔ اور جو لوگ عقل کے بجائے اسکل سے کام لیتے ہیں بہت کامیاب رہتے ہیں۔

ایک بچہ بھی فلم بنا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے پاس ڈیڑھیر سا لاروی پیسہ ہو۔ آجکل ایک معمولی فلم بھی چھ سات لاکھ روپے سے کم میں نہیں بنتی اور اچھی فلمیں تو تیس چالیس لاکھ تک جاتی ہیں۔ جس فلم میں جتنی کم عقل اور جتنا زیادہ روپیہ استعمال کیا جائے گا وہ اتنی ہی کامیاب ہوگی۔

اگر آپ کے پاس عقل ہے تو اس عقل سے روپے کو خریدنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اگر آپ کے پاس روپیہ ہے تو

اس سے عقل کو خریدنا مہبت آسان ہے۔ کیونکہ عقل والے ہزاروں کی تعداد میں فلم کے بازار میں اپنے اپنے نواپنے لگا

عقل بیچتے نظر آتے ہیں۔ کوئی اپنا قلم بیچتا ہے۔  
کوئی اپنا رنگ روپ کوئی اپنا منہسر کوئی فن — جو جکے پاس  
پاس ہے بیچتا چلا جا رہا ہے۔

آج کل منہگائی کا زمانہ ہے سوائے عقل کے ہر چیز  
کے دام بڑھ گئے ہیں۔ آج کل گو بھی منہگی ہے۔ مگر عقل سستی  
ہے۔ کپڑا منہگا ہے مگر عقل سستی ہے۔ مکان منہگا ہے مگر عقل  
ستی ہے۔ اتنی سستی ہے۔ کہ بازاروں میں پڑے پڑے  
سٹریڈ ہی ہے اور کوئی پوچھتا نہیں۔

اس لئے بچو! اگر تم فلم بنانا چاہتے ہو تو عقل کی  
دم میں ٹھاکہ باندھو۔ اور کہو!

”ع سے عقل۔“



## ”غ سے غنڈہ“

غنڈہ ولن کا چچہ ہوتا ہے۔ غنڈہ ہاتھ چلاتا ہے۔  
 پاؤں چلاتا ہے۔ اور سر میں چونکہ عقل نہیں ہوتی۔ اس لئے  
 سر سے بھی ٹکریا مار لینے کا کام لیتا ہے۔  
 غنڈے کو لوگ اکثر برا بھلا کہتے ہیں مگر غنڈہ دراصل  
 بہت معصوم اور سھولا بھالا ہوتا ہے۔ وہ بے چارہ تو بالکل بیل  
 ہوتا ہے۔ جسکی نکیل اس کے مالک کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور  
 مالک اس کی نکیل سے اسے جدھر چاہے گھما دیتا ہے۔  
 ابھی میں نے غنڈے کو ولن کا چچہ کہا مگر چچہ اور غنڈہ  
 میں بہت فرق ہے۔ چچہ کبھی وقار دار نہیں ہوتا۔ غنڈہ ہمیشہ  
 وقار دار ہوتا ہے۔ چچہ چالاک ہوتا ہے۔ غنڈہ سیدھا  
 سادھا ہوتا ہے۔ چچہ اپنے آپ کو کبھی خطرہ میں نہیں ڈالتا۔  
 غنڈہ اپنے مالک کے لئے جیل تک چلا جاتا ہے۔ غنڈہ  
 بالکل سبیل ہے بیل۔

اس لئے بچو ! اگر تم بیل نہیں انسان بننا چاہتے  
ہو تو کہو۔  
"غ سے غنڈہ !"



"ت سے فلم !"

جب ہم دودھ پیتے بچے تھے تو ابھی فلم ایجاد نہیں ہوئی  
تھی۔ آجکل دودھ پیتے بچے بھی فلم دیکھتے ہیں۔ اس لئے فلم کے  
بارے میں آپ کو کیا بتا سکتا ہوں۔ آجکل کے بچے فلم کے  
بارے میں بڑوں سے زیادہ جانکاری رکھتے ہیں۔

ایک دن جب میں محکمہ تعلیم کا ایک انسپکٹر تھا۔  
ایک اسکول کا معائنہ کرنے کے لئے پہنچا۔ اور کچھ بتائے بغیر  
چھٹی جماعت کے بچوں سے سوالات کرنا شروع کر دیئے۔  
بچوں کی معلومات دیکھ کر میں حیرت میں رہ گیا۔



چند سوال و جواب نمونے کے طور پر تحریر ہیں۔ کیونکہ  
چند سوالوں کے جواب میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔  
سوال :- ترکوں کے بارے میں اپنی معلومات بیان  
کرو۔

جواب :- زبانِ یارِ من ترک کی کا گیت وہیں سے آیا ہے۔

سوال :- جنوبی ہند کے بڑے بڑے شہروں کے نام لو۔

جواب :- جمینی، واسن، اے دی ایم اور مدراس۔

سوال :- نور جہاں کا اصلی نام کیا تھا۔

جواب :- نسیم بانو۔

سوال :- شہیدِ اعظم بھگت سنگھ کون تھا۔

جواب :- منوج کمار۔

سوال :- تاج محل کس نے بنوایا۔

جواب :- پروڈیوسر کریم بھائی ٹڈیا ڈوالا نے !

اسی قبیل کے جواب سن کر میری معلومات میں وہ

شاندار اضافے ہوئے ہیں کہ میں نے اسی جنرل نالچ کی بنا پر  
یہ فلمی قاعدہ لکھنے کی جرات کی ہے۔

اس لئے یچو ! اپنی دہ سی کتابوں کو ردی کی ٹوکری

میں ڈالو۔ اور کہو۔

”ف سے فلم۔!“



”ق سے قنچی۔!“

قنچی سینسر کے پاس ہوتی ہے اور سینسر حکومت کا وہ ادارہ ہوتا ہے۔ جو کسی فلم کو پاس کرتا ہے۔ یا فیل کرتا ہے۔ جو اس امر کا فیصلہ کرتا ہے کہ آیا یہ فلم اس قابل ہے کہ اسے پبلک کو دکھایا جاسکے۔

فلم پر وڈیو سرائیم بم سے اس قدر نہیں ڈرتا ہے۔ جب قدر وہ سینسر کی قنچی سے ڈرتا ہے۔ اگر آپ بھی انہی فلموں میں وہ متاثر نہیں دیکھتے ہیں جن کو دیکھنے کی آپ کو ہوس ہے یا حسرت ہے تو اس کے لئے سینسر کی قنچی ذمہ دار ہے۔ اور اگر کوک شاستر اور فلم میں کوئی فرق باقی ہے۔ تو محض

سنیر کی قینچی کے سہارے — اس لئے فلم سنیر بورڈ  
کی قینچی کو دعا دیجئے۔ اور کہئے۔  
"ق سے قینچی - !"



## "ک سے کشمیر"

"ک سے کشمیر ہے، جس کے بغیر آجکل کوئی ہندوستانی  
فلم مکمل نہیں ہو سکتی۔ چند سال پہلے یہی حیثیت ناگ کو حاصل  
تھی۔ ہر کچپر میں کسی نہ کسی طرح سے ناگ دکھا دیا جاتا تھا۔  
ناگ ہے کہ سہیرو کے سامنے پھن پھیلائے کھڑا ہے۔ ہیروئن  
کے قدموں سے لپٹا جا رہا ہے۔ ولن کو ڈس رہا ہے۔ کسی نہ  
کسی شاٹ میں ناگ کو دکھانا ضروری تھا۔ اس زمانے میں ناگ  
کے نقبیر کوئی کچپر نہیں چل سکتی تھی۔ آجکل کشمیر کے بغیر  
نہیں چل سکتی۔ کہتے ہیں کہ آجکل ہیرو اور ہیروئن فلم کے

کانٹریکٹ پر دستخط کرنے سے پہلے پوچھ لیتے ہیں۔ ”کیوں صاحب !  
اس فلم میں کتھیر ہے۔“

اگر ہے تو کانٹریکٹ پر دستخط ہو جاتے ہیں ورنہ کہانی بدلنا  
پڑتی ہے۔ !

ک سے کڑ کی بھی ہے جو کتھیر سے آنے کے بعد شروع  
ہوتی ہے۔ کتھیر میں سیر سپاٹا کرنے اور اندھا دھند روپیہ  
اڑانے کے بعد فلم کمپنی پر ایک لخت کڑ کی چھا جاتی ہے۔۔۔ ملازموں  
کو تنخواہیں نہیں ملتیں۔ ایکٹروں کی قسط روک دی جاتی ہے۔ وہ کی  
کی بوتلوں میں ٹھہرا ڈال کے پیا جاتا ہے۔ اور آفس کا کرایہ چڑھنا  
شروع ہو جاتا ہے۔ یہ تنگی جسے مہینی کی زبان میں ”کڑ کی“ کہتے ہیں۔  
مہینوں تک چھائی رہتی ہے۔ سب فلم والے کڑ کی کا مزہ جانتے ہیں۔  
اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ ایک مہینے وہ کی پنا چھ مہینے ٹھہرا پنا  
ایک مہینہ کرایہ دینا اور دس مہینے نہ دینا۔ ایک مہینہ پلاؤ کھاؤ  
اور دوسرے مہینے چنے چبانے ان کی عادت میں شامل ہو چکا ہے۔  
سنا ہے کہ افریقہ کا اونٹ صحرا میں کھائے پئے بغیر آٹھ دن  
تک زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن فلم کے ریگستان میں چلنے والے اونٹ  
مہینوں کھائے پئے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ ! زندگی کا یہ اتنا

معجزہ ہے جس پر سائنسداں کو جلد سے جلد توجہ دینی چاہیے۔  
 ک سے کہانی بھی ہے مگر چونکہ یہ ہر دوسرے دن بدلتی  
 رہتی ہے اس لئے اس کے متعلق کچھ کہنا لا جا عمل ہے۔  
 ک سے کہنی ہے۔ جہاں فلم کا کاروبار ہوتا ہے۔  
 ک سے کٹ ہے، جو ہر شارٹ کے بعد بولا جاتا ہے  
 لیکن ان سب میں مزے کی چیز ہے کشمیر۔ اس لئے یاد  
 رکھو۔

”ک سے کشمیر۔“



”کھ سے کھیشتر۔“

(امیدان)

کو رو کھیشتر میں مہا بھارت کی جنگ لڑی گئی فلم کے  
 کھیشتر میں ہر روز مہا بھارت کی لڑائی ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا



ہے کہ یہاں درویدی کے بجائے ہیسروین کا ہرن ہوتا ہے۔  
 گدوا کے بجائے چیک بک کا ایڈوانس دیا جاتا ہے۔ ارجن  
 کے بان کی بجائے نظروں کے بان چلائے جاتے ہیں۔ ساکنڈی  
 کے بجائے پاکسنڈی آتے ہیں۔ لیکھک کو بھیشم پیامہ کی طرح  
 گھائل کر کے تیرول کے بستر پر ٹھا دیا جاتا ہے۔ اور پروڈیوسر  
 ادھار کا ابھینو چکر چلا کر سب کو الجھاتا جاتا ہے۔ یہاں نیچے  
 کی جگہ کمیسر بین اور ساؤنڈ ریکارڈسٹ ہوتے ہیں اور دیکھنے  
 والے سب دھرت راشٹر کی طرح اندھے ہوتے ہیں۔  
 آؤ آؤ مہا بھارت کی لڑائی دیکھو۔

صرف ایک روپے ہیں !

"کم سے کمیشٹر۔"



”گ سے گاڑی۔“

”گ سے گاڑی، ریل گاڑی نہیں۔ بلکہ موٹر گاڑی، زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح فلم میں بھی گاڑی عزت کا سب سے بڑا نشان ہے۔ آجکل آدمی اپنے کام سے نہیں اپنی گاڑی سے پہچانا جاتا ہے۔ گھر میں چاہے بھونی سھانگ تک نہ ہو۔ صوفہ نہ ہو۔ راشن نہ ہو۔ چائے نہ ہو۔ بچوں کے لئے اسکول کی قمیض تک نہ ہو۔ لیکن گھر کے باہر گاڑی ضرور کھڑی ہو۔ جب تک گاڑی چلتی ہے آپ کی فلم چلتی ہے۔ اس لئے تو سہگت کیمرے ”چلتی کو گاڑی“ کہا ہے؛ اور اسی لئے فلم میں ہر منفرد آدمی گاڑی دکھاتا ہے۔ گاڑی نہیں ہو یا پرانی، الٹی ہو یا سیدھی۔ اس سے بحث نہیں۔ لیکن وہ لبنی ضرور ہونی چاہیے اور جس آدمی کے پاس جتنی لمبی گاڑی ہوگی اتنا ہی لمبا کانٹرکٹ اسے فلم میں ملے گا۔ اس لئے سہگوان کے بعد ہمیشہ گاڑی کا دھیان دھرو۔ اور کہو۔

”گ سے گاڑی۔“

”گھ سے گھپلا۔!“

یہ ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ لیکن فلمی دنیا میں کچھ زیادہ ہی پایا جاتا ہے۔ دوسری جگہوں پر کبھی کبھی گھپلا ہوتا ہے۔ یہاں پوری فلم گھپلے بازی میں بنائی جاتی ہے۔ دوسری جگہوں پر اس لفظ کا استعمال کبھی کبھی ہوتا ہے۔ یہاں ہر روز ہوتا ہے۔

ویسے یہ لفظ بہت خطرناک ہے۔ اگر کوئی پروڈیوسر کسی کہانی لکھنے والے کے کندھے پر ہاتھ مار کے بڑی محبت سے کہے ”یار“ کیا بتائیں۔؟ عجب گھپلا ہو گیا۔!“ تو سمجھ لو کہ اس کہانی کا رکا اس کی فلم سے پتہ کٹ گیا۔ اگر کوئی ہیرو۔ پروڈیوسر سے یہی کہے تو سمجھ لو کہ وہ شوٹنگ کی ڈیٹ کنسل کر کے پندرہ روز کے لئے کہیں باہر کو جانے والا ہے۔ اگر ہیروئن یہی کہے تو سمجھ لو کہ وہ اپنی انکم ٹیکس کی اگلی قسط کے لئے پیسے مانگنے والی ہے۔ اور اگر ڈسٹری بیوٹر پر ویسٹ سے کہے تو سمجھ لو کہ وہ اس کا چیک ڈس آئر Dishonour کر لئے والا ہے۔!

کوئی فلم والا کسی موٹی سے موٹی نکالی سے اتنا نہیں گھبرااتا ہے۔  
 جتنا اس ایک لفظ "گھیلے" سے! اس وقت چاہے تم اس لفظ  
 کو یاد رکھو نہ رکھو لیکن اگر کبھی فلم میں گئے تو ہر روز اس کو  
 یاد کرو گے اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہو گے۔  
 "گد سے گھیلے"۔!



"ل سے لکھنے والا"۔!

عام لوگوں کا خیال ہے کہ فلم بننے سے پہلے لکھی جاتی  
 ہے۔ یا لکھی جاتی ہوگی۔ کبھی کبھار ایسا ضرور ہوتا ہے۔ مگر عام طور  
 پر فلم پہلے بنتی ہے بعد میں لکھی جاتی ہے۔ آپ پوچھیں گے بعد  
 میں لکھنے سے کیا فائدہ؟ وہ اس لئے کہ جب فلم تیار ہو کے  
 سینسر کے پاس جاتی ہے تو سینسر اپنی قیمتی چلانے سے پیشتر  
 فلم کا کاغذی مسودہ مانگتے ہیں۔ اس وقت لکھنے والے کی ضرورت

ڑتی ہے۔ لکھنے والا جسے کچھ لوگ لیکھک یا ادیب بھی کہتے ہیں اس وقت کام میں آتا ہے۔ اور فلم کو دیکھ کر فلم کے مکالمے اور سین ایک بڑی لفٹ بک ہیں درج کرتا جاتا ہے۔ جسے فلم کے لوگ "چوٹری" کہتے ہیں۔ چوٹری تیار کرنا لیکھک کا سب سے اہم کام ہے۔ اس کے علاوہ وہ فلم بننے بننے پہلے ایک کہانی بھی پروڈیوسر کو سناتا ہے۔ جسے فوراً رد کر دیا جاتا ہے اس کے بعد لیکھک کو ایک کہانی سنائی جاتی ہے۔ یہ کہانی ڈائریکٹر سناتا ہے۔ ڈائریکٹر کو یہ کہانی پروڈیوسر نے سنائی ہوتی ہے اور پروڈیوسر کو ہیرو نے اور ہیرو کو اس کے سیکرٹری نے اور سیکرٹری نے غالباً کسی ہالی ووڈ کی فلم سے چرائی ہوتی ہے۔ اسی طرح سے یہ کہانی لیکھک کے گلے منڈھ دی جاتی ہے۔

اسی طرح سے منظر نامہ اور مکالمہ تیار ہوتا ہے۔ اسٹوڈیو کے سیٹ پر ہیرو گزشتہ رات کی دیکھی ہوئی کسی مغربی فلم کے مکالمے یاد آتے ہیں۔ وہ لیکھک کے نبائے ہوئے مکالمے رد کر کے اسی وقت وہی رات والے مکالمے بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح ہیروین نے بھی کوئی تصویر دیکھی ہوتی ہے جس کے مکالمے اسے پسند ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی پسند کے مکالمے بولتی ہے۔



ہیرو سین کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ہیرو سن اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بے چارہ لیکھک سین کو بچانے کے لئے کبھی ہیرو کی طرف دوڑتا ہے۔ کبھی ہیرو سن کی طرف۔ اسی دوران کا میڈین آجاتا ہے۔ اور وہ سین کو اپنی طرف کھینچنے لگتا ہے۔ اس کھینچا تانی میں اکثر سین پھٹ جاتا ہے۔ پھر اس کے ٹکڑے لیکھک کے حوالے کئے جاتے ہیں اور اسے اسٹوڈیو کے ایک کونے میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ آرام سے اپنے پھٹے ہوئے چہیتھروں کو اپنی فلم کی سوئی اور خیال کے دھاگے سے سینے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب وہ سین کو کسی کمر اور اس کے ٹکڑے جوڑ کر ڈائریکٹر کے پاس واپس آتا ہے۔ تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ سین تو شوٹ ہو چکا۔

اسی طرح سین پر سین شوٹ ہوتے رہتے ہیں۔ مکالمے تیار ہوتے رہتے ہیں۔ فلم بنتی رہتی ہے۔ اور جب فلم بن جاتی ہے۔ تو اس پر لکھنے والا کا نام دے دیا جاتا ہے۔ جس کم جہاں پاک۔

”ل سے لیکھک۔“



”م سے مکھن - ا“

یا

مسک

م سے مکھن جسے زبان بھی مسک کہتے ہیں۔ دوسری جگہوں پر مکھن کھایا جاتا ہے۔ بھی میں مکھن یعنی صرف مسک لگایا جاتا ہے اور اگر ایک بار لگاتے سے شفاء نہ ہو تو بار بار لگایا جاتا ہے۔ بھی میں مسک ہر قسم کا ہوتا ہے۔ اور بافراط ملتا ہے۔ لیکن سب سے اچھا مسک وہ ہے جو فلمی ڈیڑی فام میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایسا چکنا دھیر اور گداز ہوتا ہے کہ اسے لگاتے ہی چہرے کے سارے ہاسے اور ان کے داغ غائب ہو جاتے ہیں۔ اور خبیث سے خبیث صورت فلمی انسان بھی فرشتہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس مسک کے سامنے ”دوغن خان“ کی بھی کوئی حیثیت نہیں اور جو لوگ باہر جا کر دلائیت تک کو ہاتھ دگا آئے ہیں ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ بھی کا مسک اصل ہے اور باقی سب نقل ہے۔

اس مسک کے لگانے کی بھی ایک ترکیب ہے جو دراصل مسک

کی ڈلی کے ہمراہ روانہ کی جاتی ہے تاکہ ہر خاص و عام اس سے فائدہ اٹھائیں۔  
اور بارگاہ الہی میں بندے کے حق میں دعا پہونچائیں۔

یوں تو مسکد رگٹانے کی بہت سی ترکیبیں ہیں ایک تو وہ ہے  
جیسے بٹنی کے محاورہ میں کہا گیا ہے۔ ”جیسا منہ ویسا مسکد“ یعنی آدمی  
جتنا فلس رتبے کا مالک ہوگا اسے اسی اعتبار سے مسکد لگایا جائے گا۔  
مسکد بھی پتلا ہوتا جائے گا۔ حتیٰ کہ آخر میں بالکل کھوپڑے کا نیل ہو کر رہ  
جائے گا۔ اسی موقع کے لئے بٹنی والے کہتے ہیں مسکد دکھیو مسکے کی  
دھار دکھیو۔

لیکن مسکد پتلا ہو یا گاڑھا۔ دلشی ہو یا ولایتی اسے  
مہیر دین کو بہر حال لگانا ہی پڑے گا۔ وگرنہ نہ نو من مسکد ہوگا نہ  
مہیر دین ناچے گی۔ اگر مہیر دین نہیں ناچے گی تو ہندوستانی  
نغم کیسے بنے گی۔ مسکد رگٹانے کی سب سے اچھی ترکیب میرے عزیز  
دوست شاعر اختر الایمانی نے ڈھونڈ نکالی ہے۔ وہ اس  
کے موجد نہیں ہیں۔ ایسے انہوں نے اتفاقاً دریافت کیا ہے چنانچہ  
حضرت اختر الایمانی ہدایت کرتے ہیں اور خاکسار آپ سے بیان  
کرتا ہے۔ کہ بہت دن گزرے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عروس  
ابلا د بھیجی میں ایک مشہور معروف ڈائرکٹسٹر ہوتا تھا۔ جس کا نام

صادق تھا۔ ہر جہد کہ وہ بے ریا اور پاک باز مرد تھا۔ اور اپنے  
 فن میں یکتائے روزگار تھا۔ لیکن مسک والے نکلنا بنجار کی طرح  
 کہاں کسی کا سچیا چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ یہ فلم والے اس ڈائریکٹر کے گھر  
 پہنچے جاتے اور اسے اس صفائی سے مسک لگاتے کہ جس صفائی  
 سے اس نے خود کسی کو مسک نہ لگایا ہوگا۔ اور اس کے بعد اپنا  
 کام حاصل کر کے یہ مسک باز شاداں اور سراں خوشی خوشی کنٹرکٹ  
 حاصل کر کے گھر لوٹتے اور چھوٹتے ہیں کسی بار میں بیٹھ کر کسی لال  
 پری کے درشن کرتے کیونکہ لال پری اور مسک کا بہت میل جول  
 ہے۔ کبھی مسک پہلے آتا ہے لال پری بعد میں۔ کبھی لال پری پہلے  
 مسک بعد میں۔ لیکن آتے دونوں ضرور ہیں۔ ہاں جب سے نشہ  
 بازی سرکاری طور سے بند ہوا ہے۔ یا لوگ سرکاری طور پر مسک  
 لگاتے ہیں۔ اور غیبی سرکاری طور پر لال پری کا بندوبست کرتے  
 ہیں۔ تاکہ مکھن کی دیانت میں اور دماغ کی ذہانت میں کوئی  
 کمی واقع نہ ہو۔ روایت کہتے ہیں شاعر اختر الایمانی کہ ایک  
 دفعہ چند ماہ سے بیکار تھے اور اس لئے تھلائے آزار تھے وہ  
 باندہ پل پڑمانگیں لٹکائے بیٹھے تھے اور نیچے سمندر میں کود جانے  
 کی سوچ رہے تھے کہ یکایک ان کے دل میں آیا کہ کیوں نہ مرنے سے

قبل ایک دفعہ صادق صاحب کے ہاں جا کر مسک آزمائی کی جائے شاید  
 ابیدر آئے۔ تقدیر سدھر جائے۔ کھولی کا کراہیہ بکل آئے۔ یہ سوچ کر  
 وہ مرد باندہ پل سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور دوڑتے دوڑتے صادق  
 صادق کے مکان پر پہنچا۔ وہ مشہور و معروف ڈائریکٹر اس وقت  
 انہی کہانی میں ایک سین تبدیل کر کے سپر وین کی نانی کو

رول دے رہا تھا کہ اختر الایمانی نے دروازہ کھٹکھٹا یا دروازہ  
 کھول کر ڈائریکٹر نے شاعر کو گلے لگا لیا۔ اور بڑے تپاک سے اس کی  
 کمر میں ہاتھ ڈال کے اسے صوفہ تک لے گیا۔ اور اسے اپنے سونے  
 بٹھا کے بولا۔ پہلے اپنی نظم سناؤ گے کہ پانی پیو گے۔ آخر الایمانی  
 نے کہا۔ پہلے نظم سناؤں گا۔ کیونکہ ایسے دوست پانی پلانے والے  
 تو بہت مل جاتے ہیں۔ لیکن نظم سننے والا کوئی نہیں تھا۔

صادق بہت خوش ہوا۔ اور اختر سے اس کی نئی نظم  
 سننے لگا۔ نظم چونکہ ترقی پسند تھی اس لئے کہیں سے مکے کی گنجائش  
 نہ رکھی تھی نظم سناتے سناتے اختر کو اس کا برابر خیال رہا اور وہ  
 سوچنا رہا کہ اگر وہ پرانے زمانے کا قصیدہ گو ہوتا تو کیا ہی اچھا  
 ہوتا۔ یا وہ آج کل کے زمانے کا ادب برائے روزگار کا پجاری  
 ہوتا تو وہ نہ صرف ایک قصیدہ لکھتا بلکہ فلمی پرچہ بھی صادق کے



نام نکال دینا کیونکہ اگر نو شاد کے نام فلمی پرچہ نکل سکتا ہے تو صادق کے نام کیوں نہیں نکل سکتا۔ پھر شاید ایک دن وہ بھی آجائے کہ فوراً اس کے نام ایک پرچہ نکل آئے۔ فلمی مہیروین سے لے کر سٹینڈگ بوائے تک کے نام فلمی پرچے نکل آئے۔ اختر نے سوچا اس کے بغیر فلم انڈسٹری کا زمانہ مشکل ہے۔ یہی سوچتے سوچتے اختر الایمانی نے اپنی نظم بھول گیا۔ صادق نے کہا۔ آگے سناؤ! اختر نے جلدی سے جواب دیا۔ بس یہیں تک لکھی ہے۔ صادق نے کہا۔ ”بہت اچھی نظم ہے۔“ لیکن اگر تم اسے گیت میں تبدیل کر دو تو میں تمہیں ۵۵۰ روپے میں اسے استعمال کروں گا۔ اختر یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ آج سے پانچ سال بعد کے روزگار کا مسئلہ تو حل ہوا۔ اب ان چار سالوں میں جو ہوگا اسے کسی نہ کسی طرح بھگت لیں گے۔ یہی سوچکر وہ آگے مسکدگانے کی فکر میں تھا اور جانتا نہیں تھا کہ کون سے خمیر کا مسکد گایا جائے کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک دُلا پتلا آدمی کلمے میں پان دبا کے بھاگتا ہوا اندر آیا۔ اور آتے ہی صادق صادق صاحب کے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر بیٹھ گیا۔

صادق نے حیران ہو کر پوچھا۔ کیا بات ہے سبھی۔ بانو وارد نے کہا۔ انگوٹھا نہیں چھڑوں گا۔ صادق بھائی چاہے کچھ بھی ہو!

صادق نے اور بھی پریشان ہو کر کہا۔ آخر کچھ تو کہو کیا  
بات ہے۔

نو وارد نے کہا انگوٹھا نہیں چھوڑوں گا۔ صادق سہائی  
چاہے جان چلی جائے۔

صادق نے سچا پریشان ہو کر کہا۔ مگر آخر کیوں نہیں  
چھوڑو گے میرا انگوٹھا کچھ بات تو بتاؤ۔ نو وارد نے پھر اسی  
لہجہ میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ انگوٹھا نہیں چھوڑوں گا۔ ایک  
بات ہے وہ آپ کو پوری کرنی ہوگی۔ صادق سہائی ورنہ حشر  
تک آپ کا انگوٹھا نہیں چھوڑوں گا۔

اور یہ کہہ کر نو وارد نے صادق کے پاؤں کا انگوٹھا اور  
بھی مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور حجم کرفرش پر بیٹھ گیا۔ صوف پر بیٹھے ہوئے  
صادق کے چہرہ پر ایک معصوم سی مسکراہٹ آئی اور ایک ایسی  
ہی مسکراہٹ اختر کے بھی لبوں پر آئی۔ گو وہ اتنی معصوم نہیں تھی۔  
اور سنا ہے کہ نو وارد نے اپنی بات پوری کر دالی۔ اور جب بھی  
اس نے صادق کا انگوٹھا نہیں چھوڑا۔

لیکن یہ بھی روایت ہے کہ اس کے بعد اختر وہاں  
سے فوراً ہی چل دیئے اور جب ان کے ایک عزیز دوست نے ان

سے پوچھا۔ کہ تم وہاں کیوں نہیں بیٹھے۔ جس کام کے لئے تم گئے تھے۔ اسے پورا کیوں نہیں کیا۔ ؟

تو اختر نے ایک آہ بھر کر جواب دیا۔ اسے جانتا رہا، غمگسار عزیز دوست تو ہی بنا۔ جب اس نووارد نے مسکے کے لئے صادق کا انگھوٹھا پکڑ لیا۔ تو میں کیا پکڑتا۔ ؟

جانتا دوست یہ سن کر چپ ہو گیا۔ اسی دن سے فلسی دنیا میں انگوٹھا پکڑنے کی رسم عام ہو چلی ہے۔ مرد کا انگوٹھا پکڑا جاتا ہے۔ اور عورت کی انگوٹھی پکڑی جاتی ہے۔ اور اگر پکڑنے والا سمجھ دار ہو اور عورت مہیروین ہو تو۔ اس کے سارے کے سارے زیور نمائش کر دیے جاتے ہیں۔ مگر اس کے لئے کمال مشق اور مہارت کی ضرورت ہے۔ سنا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں اس فن کے اب چند ہی استاد رہ گئے ہیں۔

آج کل بمبئی کے بوکل سٹیشنوں پر جہاں آپ کو نیل مالش والے اور بوٹ پالش والے ملیں گے۔ وہاں مسکے باز بھی مل جائیں گے۔ جو تھیلی پر مسکے کی ڈلی لئے گھومتے ہیں۔ چلا کے کہتے ہیں مسک لگو الو۔ مسک لگو الو۔ نیل مالش دو آنے میں ہوتی ہے۔ اور بوٹ پالش ایک آنہ میں اور مسک پالش صرف دو پیسے میں ہو جاتا ہے۔

اسی لئے تو بھی شہر مجھے بہت پسند ہے۔ وہاں جس روز میری جیب میں ایک آنہ ہوتا ہے۔ میں دو پیسے کے چنے لیتا ہوں مسکے لگواتا ہوں اور اس کے بعد باندھ پل پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ جاتا ہوں اور تعریف کرتا ہوں بچو! اس خدا کی جس نے مسکے نبایا۔

## ”ابتدائی مشق“

بچہ انگوٹھا چوس رہا ہے۔ — باپ انگوٹھا پکڑ رہا ہے۔ یہ سیرو سن ہے۔ وہ مسکے کی ڈلی ہے۔ بیچ میں نانی کھڑی ہے۔ کتے کو مسکے مہنم نہیں ہوتا۔ باقی سب کچھ ہو جاتا ہے۔ مسکے سے مسکے ملا کر کر لے ہاتھ۔ اور کسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات۔ !

نکسی داس کون تھا۔

اس کا آخر الایمانی سے کیا رشتہ جواب کے لئے انگوٹھا

پکڑیے۔



## ”ن سے نخرہ - !“

کسی زمانے میں حرف قلم پر وڈیو سر نخرے کیا کرتے تھے۔  
 آجکل نہیں کرتے۔ کسی زمانے میں ڈائریکٹر نخرے کرتے تھے۔ وہ  
 زمانے بھی لد گئے۔ بیچ میں کچھ عرصہ کے لئے سنگیت کار اور گیت کار  
 نخرے کرتے لگے تھے۔ مگر جلد ہی اپنی حیثیت کو پہچان کر چپ ہو گئے۔ ہیروئن  
 کہ بے چارہ عورت ہوتی ہے۔ آج بھی نخرہ کرنے پر مجبور ہے۔ مگر اب  
 اس کا زمانہ بھی چلا گیا۔

آجکل حرف ہیروئن نخرے کرتا ہے۔ مثال کے طور پر - !  
 (۱) جو آدمی اسٹوڈیو میں سب سے آخر اور سب سے لیٹ  
 آتا ہے وہ ہیرو ہوتا ہے۔  
 (۲) جو میک اپ کرنے میں سب سے زیادہ وقت لیتا ہے۔  
 وہ ہیرو ہوتا ہے۔

(۳) آٹھ گھنٹے کام کرنے کے بجائے جو حرف چار گھنٹے کے  
 بعد سرور کا بہانہ کر کے اسٹوڈیو سے رخصت ہو جاتا ہے۔ وہ حرف



ہیرو ہو سکتا ہے۔

(۴) جس کے ڈرائیور کو لوگ سلام کریں۔ جس کے سیکرٹری کو لینے کے لئے لوگ اسٹوڈیو کے دروازہ تک استقبال کے لئے جائیں۔ جسے دیکھتے ہی سیٹ پر ڈائریکٹر سپاہی کی طرح آئین مشن ہو جائے۔

وہی ہیرو ہوتا ہے۔

ہیروئن بھی نخرے کرتی ہے۔ مگر کم کم۔ اس بے چاری کے نخرے نسوانی اور رومانی قسم کے ہوتے ہیں اور زیادہ تر ہیرو کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ فلم کے دوسرے لوگوں سے اس کا واسطہ بہت کم پڑتا ہے۔ اعلیٰ نخرہ تو ہیرو کا ہے۔ اور جو آدمی ہیرو کے نخرے میں زیادہ گرم مصالحہ ڈالے گا۔ اتنا ہی کامیاب ہوگا۔

”ن سے نخرہ۔!“



## "ن سے نام - !"

ہر فلم کا ایک نام ہوتا ہے۔ پہلے صرف ایک لفظ والے نام  
پسند کئے جاتے تھے۔ جیسے "کنگن"۔ "بندھن"۔ "ملن"۔ وغیرہ  
پھر دو لفظ والے نام پسند کئے جانے لگے۔ جیسے "سدا سہاگن"۔  
"ہوا سویرا"۔ "ہم لوگ"۔ "کوہ نور"۔ پھر تین الفاظ والے  
نام فیشن میں آ گئے۔ جیسے "بانگ کا سینہ دور"۔ "جنت کی خور"۔  
"دل سے دور"۔ پھر چار لفظوں والے نام پاپر ہو گئے۔ جیسے  
"ہمارا کیا ہے قصور"۔ "دل تو ہے مجبور"۔ "ہم یہاں تم وہاں"۔  
"چراغ کہاں روشنی کہاں"۔ اب نام اتنے لمبے ہو گئے ہیں کہ انہیں  
پڑھتے پڑھتے فلم کی آدھی ریل ختم ہو جاتی ہے۔ اس حساب سے اگر  
نام لمبے ہوتے گئے تو فلم، انٹروال کے بعد شروع ہوا کر لگی۔

بعض فلموں کے نام اس طرح کے ہوتے ہیں کہ بچے ان کے  
ذریعہ پہاڑے اور گنتی آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔ جیسے "ایک،  
دو تین"۔ "چار"۔ "پانچ"۔ "چھ"۔ "نو"۔ "دو"۔ "گیارہ"۔ "ایک دل

چارہ ہیں۔ " ایک دل ڈوا فسانے۔ " ایک آٹھ مہانے۔  
 بعض ناموں سے جغرافیہ کا پتہ چلتا ہے۔ جیسے۔ " بغداد  
 کا چور۔ " لکھنؤ کی ڈور۔ " روسیہ کی کھنڈ کا مور۔ " لندن  
 کی بھور۔ " نیو یارک کا شور۔ " افریقہ کا آدم خور۔ "

ہمارے کچھ فلم سازوں کو کچھ عرصہ سے یہ دھن سوار ہے۔  
 کہ ہمارے اُن پڑھ اور جاہل عوام کو انگریزی سکھائی جائے۔ اسلئے  
 وہ لوگ اپنی فلموں کے نام صرف انگریزی میں رکھتے ہیں۔ جیسے

" Love in Simla " لوہ ان شملہ

" Love in Hong Kong " لوہ ان ہانگ کانگ

" Love in Japan " لوہ ان جاپان۔

" Love in Honolulu " لوہ ان ہونولولو۔

" Love in Timbaktu " لوہ ان ٹمبکٹو۔

کچھ لوگ برتنوں کے نام یاد کراتے ہیں۔ جیسے " پریم کی

گناہ۔ " " تین کٹورے۔ " " پوجا کی تھالی۔ " " چائے کی بالٹی "

معلوم ہوتا ہے۔ گھر میں برتن ہی نہیں ہیں۔ !

آج کل پر اسرار فلموں کا مذہب ہے۔ ان فلموں کے نام

بھی پُر اسرار ہوتے ہیں۔ جیسے " وہ کون تھی۔ " " وہ کیا تھی ؟ "

”وہ کیوں تھی؟“ انہیں مزید پُراسرار بنانے کے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ ”وہ کیا تھی۔“ کے بجائے نام یوں کہو — وہ؟ تھی....  
 نہ! تھی — وہ تھی..... یا! نام کا نام۔ کراس ورڈ  
 کا کراس ورڈ۔

پروڈیوسر اگر عقل والا ہوتا تو نام کے بجائے پہیلی رکھ دے  
 اور لاکھوں کما لے۔

”ن سے نام۔“



”و سے ولین - !“

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ لوگ ولین کو اسکرین پر دیکھتے  
 ہی گالیاں سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ ولین کو فلم میں اسی لئے رکھا  
 جاتا ہے کہ لوگوں کو گالیاں دینے کی جو عادت سے اس کا مناسب استعمال  
 ہوتا ہے۔ ورنہ عین ممکن ہے کہ ولین کی غیر موجودگی میں وہ کہیں  
 مہیرو۔ مہیروین یا پروڈیوسر کو گالیاں سنانا شروع  
 کر دیں۔ اسی لئے جس ولین کو جتنی زیادہ گالیاں ملتی ہیں۔ فلم  
 کمپنی سے اسے اتنے ہی زیادہ پیسے ملتے ہیں۔ ایک دفعہ میں اپنے  
 ایک ولین دوست کے ساتھ اس کی کچر دیکھنے گیا۔ کچر دیکھنے  
 کے بعد جب ہم سینما سے نکلے، تو ولین رو رہا تھا۔ میں اس  
 کے آنسو دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ پھر خیال آیا کہ فلم چونکہ  
 ایک موثر ٹریجڈی تھی اس لئے ممکن ہے ولین اسے دیکھ کر  
 رویا ہو۔ اس لئے میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تم اس لئے رو  
 رہے ہو کہ فلم بہت ٹریجک ہے۔“



وہ ملین بولا۔ "نہیں۔ میں تو اس لئے رو رہا ہوں کہ آج ان تین گھنٹوں میں جب تک میں ہال میں بیٹھا رہا کسی ایک آدمی نے مجھے گالی نہیں دی۔ اب اگلی یکشنبہ میں یہ پروڈیوسر مجھے کیوں لے گا۔"

یوں تو سب لوگ وہ ملین کو پسند کرتے ہیں لیکن جو سوکھے دے تیلے اور کمزور جسم کے ہوتے ہیں۔ وہ خاص طور پر وہ ملین کو پسند کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو زندگی میں اگر کسی کو گالی دیں تو وہ مار مار کر انکی کھال میں بھوسہ بھسے دے۔ اسی لئے ایسے لوگ ہر روز سینما کا ٹکٹ خرید کر ہال میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور وہ ملین کو دیکھتے ہی اس پر گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں۔ وہ چیختے ہیں۔ چلاتے ہیں۔ گھولنے دکھاتے ہیں۔ ان کا بس چلے اور پولیس کا ڈرنہ ہو۔ تو اسکرین بھی پھاڑ دیں۔ ان سب لوگوں کے لئے وہ ملین ایک نعمت ہے کیونکہ وہ ان کے جیون کی ہر گھٹن کا جواب ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ وہ ملین کے بغیر فلم ایک منٹ سے زیادہ نہیں چل سکتی۔ آپ ذرا سوچئے کہ فلم میں جب ہیرو اور ہیروین کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے ایسے

موقعے پر اگر ولین بیچ میں نہ آئے تو فلم پہلے ہی سین میں ختم ہو جائے۔ اسی لئے تو ولین کہانی کے بیچ بیچ میں آتا رہتا ہے۔ اور فلم کو آگے چلاتا رہتا ہے۔ ایسے اہم کردار کو فلم میں کسی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ! دراصل ولین ہی ایک کردار ہے۔ جو ہر موقع پر کھلتا ہے۔ اس لئے.....  
کہو۔

”و سے ولین ..!“



”ھ سے ہیروئن یا ہیرو!“

منفصل دیکھو الف سے اکیڑ یا اکیڑیس.....  
 ویسے ہیرو یا ہیروئن کا بیان اس فلمی قاعدے  
 میں اس قدر ہو چکا ہے کہ میں ان کے متعلق مزید کچھ بتانا  
 نفعی اوقات ہوگا۔ !



”ی سے یاھو ۔ !“

ہر نئی نسل کا ایک نعرہ ہوتا ہے ۔  
جب ہم جوان تھے — تو ہماری نسل کا نعرہ تھا ”انقلاب  
زندہ باد ۔“

جب ۴۲ء کا زمانہ آیا تو اس وقت کی نئی نسل نے  
نعرہ لگایا ۔ ”Quit India“ انگریز ہندوستان  
چھوڑ دو ۔

جب انگریزوں نے ہندوستان چھوڑ دیا تو ملک آزاد  
ہو گیا ۔ آزادی کے بعد ایک نئی نسل پیدا ہو گئی ہے اس نئی نسل  
کا نعرہ ہے ۔

”یاھو ۔ !“

روتی نہیں ۔ روٹی نہیں ۔ انقلاب نہیں ۔ تہذیب  
نہیں ۔ زندگی نہیں ۔ صرف  
”یاھو ۔“

جاذ کی دھن پر ناچتے قدموں سے، تھک کتی  
 کمر سے ہلتے بازوؤں سے گردش کرتی ہوئی آنکھوں  
 سے، جسم کے ڈولتے ہوئے ہر انگ سے، ماضی،  
 حال اور مستقبل کے ہر تقاضے سے بے نیاز ہو کر  
 اپنا پورا حلق سپھاڑ کر چلاؤ۔

"یا اھو۔"

یا اھو — فلم انڈسٹری کی نئی نسل کا قومی نعرہ

ہے۔ !





## آخری مشق

باپ حقیقہ پی رہا ہے۔ ماں وال بگھا رہی ہے۔ بیٹا اولاد  
سے آیا ہے۔ ماں کو پھر مارتا ہے۔ اس کا نام ٹر بیڈی  
ہے۔ !

ہیر و آیا۔ ولن بھاگا، ہیر و سن شرمائی، نپٹت  
نے شادی رچائی، لوگ تالی بجاتے ہیں۔ آسمان سے سچول گرتے  
ہیں۔ اس کا نام کامیڈی ہے۔

اشوک کمار ہنسا ہے..... الہاس گھورتا ہے.....  
راجندر کمار مسکراتا ہے..... دارا سنگھ ڈنڈ پیتا ہے۔  
یہ سوشل کے ہیر و ہیں۔ وہ اسٹنٹ کے گھوڑے ہیں۔  
کہانی روک لافا مارتا..... کہانی روک طوفان لانا...  
..... کہانی روک گیت گاہ۔ یہ فلم کے لیکھک ہیں۔ وہ نبارس  
کے ٹھگ ہیں۔

ہیر و دیکھ چھپے ہیر۔ چالو ہو جا۔ نہیں توفیق کر!

نہی چمبیا آئی — پرانی سیروین گھبراہٹ بھیرو  
نے گھبرا — شوٹنگ کرتے کرتے ہو گیا سویرا۔

گھپلا کر! ..... جھانسنہ دے! ..... دھدھورا  
پیٹ ..... سلور جیلی مٹا۔! ! !

ستاروں کو مسکد لگا۔ کشمیرے جا — تھیلی کھول  
— یا ہولول — تو ڈاڑھی کھڑے — وہ ایکڑ ہے۔  
فلم سینس ہوئی — فنا نسر کی عند قچی بند ہوئی —  
کڑکی شروع ہوئی۔

باپ گھریں ہے۔ سیروین باغ میں ہے۔ ہیرو  
درخت پر ہے — گانا چل رہا ہے۔ ..... پروڈیوسر  
گھاس کھا رہا ہے۔

موٹر بھاگی — گاڑی سے ٹکرائی — سیروین زخمی ہے۔  
ہیرو ڈاکٹر ہے — محبت ہوتی ہے — فلم بنتی ہے۔  
پاکس آفس چلتا ہے — قوم کا بیڑا غرق ہوتا ہے۔





# “گیدڑ کی تلاش”

(پہلی فلمی حکایت)





ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک جنگل میں ایک گیدڑ مر گیا۔ اتفاق سے اس جنگل میں وہی ایک گیدڑ تھا۔ اس لئے گیدڑ کے مرنے کا غم سب کو ہوا لیکن شیر کو بہت زیادہ غم ہوا کیونکہ شیر اور گیدڑ کا ہمیشہ جنگل میں ساتھ رہتا ہے۔ جدھر جدھر شیر جاتا ہے گیدڑ اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے کبھی کبھی آگے بھی جاتا ہے۔ اور نہ کاری کی ٹوہ رکھتا ہے۔ اور شیر کو آگے بتاتا ہے۔ کیونکہ گیدڑ خود شکار نہیں کر سکتا ہمیشہ شیر کے شکار سے اپنا حصہ لیتا ہے۔ جب شیر شکار کر لیتا ہے اور اچھی طرح سے اپنا پیٹ بھر لیتا ہے۔ تو بچا کھچا گیدڑ کے حوالہ کرتا ہے۔ جس سے گیدڑ کا کام چل جاتا ہے۔

اس کے بعد سنتے ہیں کہ گیدڑ شیر کو جنگل کی تمام خبریں جھوٹی اور سچی سناتا ہے۔ اور مزے مزے کے سکینڈل بھی اور جن جانوروں

سے اس کی دشمنی ہوتی ہے ان کی چنڈیاں کھاتا رہتا ہے۔ اور شیر کی خوش آمد کر کے اور اس کے نلوے پاٹ کر اپنا مطلب نکلتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے شیر گیدڑ سے بہت خوش رہتا ہے۔ گیدڑ کو شیر کی ضرورت ہے۔ اور شیر کو گیدڑ کی۔

چنانچہ جب گیدڑ مر گیا تو شیر بہت پریشان ہوا اس نے کسی دوسرے گیدڑ کی تلاش میں سارا جنگل چھان مارا لیکن جنگل میں اسے کوئی گیدڑ نہیں ملا پھر شیر لے اگلے چھ سات دن میں اس پاس کے بہت سے جنگل دیکھ ڈالے اسے کہیں پر کسی گیدڑ کی صورت نظر نہیں آئی۔

ماجر اکیا ہے۔ شیر نے پریشان ہو کر جنگل کے سب سے بوڑھے اور عقلمند لومڑے سے پوچھا۔ جنگل میں کہیں پر کوئی گیدڑ دکھائی نہیں دیتا۔

عقلمند لومڑے نے دست بستہ عرض کی، حضور جتنے گیدڑ تھے سب شہروں کو چلے گئے ہیں۔ انہوں نے جنگل چھوڑ کر شہروں میں بود و باش اختیار کر لی ہے۔

کیوں۔ شیر نے پوچھا۔

آج کل شہر میں گیدڑوں کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے اور

پھر یہ بات بھی ہے کہ فی زمانہ جنگل میں وہی جانور رہ سکتا ہے۔  
 جو بے حد جفاکش اور محنتی ہو۔ جو زمانہ کی سرزد گرم اٹھا سکتا ہو  
 اور یہاں آپ جانتے ہیں کبھی شکار ملتا ہے کبھی نہیں ملتا ہے۔ کبھی  
 گیدڑ کیا شیر کو بھی بھوکا رہنا پڑتا ہے۔ اور گیدڑ تو سدا سے کام  
 چور ہے۔ اس لئے شہر کو بھاگ گیا ہے۔

شیر یہ تشریح سن کر چپ ہو رہا۔ مگر اس کا دل جنگل میں  
 گیدڑ کے بغیر نہیں لگتا تھا۔

جب چند دن اور گزر گئے اور کہیں پرانے کسی گیدڑ کی  
 صورت نہ دکھائی دی تو وہ سیدھا شہر گیا اور وہاں کے ایک  
 روزانہ اخبار میں اس نے پہلے صفحہ پر ایک اشتہار یوں دیدیا۔

## ”گیدڑ کی ضرورت ہے“

جنگل کے ایک شیر کو گیدڑ کی ضرورت ہے، چالاک، چرب  
 زبان، تجربہ کار، شکار کی ٹوہر کھنے والے شیر کا دل بہلانے والے  
 مزے دار پر لطف اسکنیدل منانے والے ایک گیدڑ کی ضرورت ہے۔

صرف وہی لوگ (گیڈر) درخواست دیں جنہیں اس کام میں پانچ سال کا تجربہ ہو۔

منتخب گیڈر کو ڈبل سہتہ دیا جائیگا۔ اس کی زندگی کا بیمہ کیا جائے گا، سیکورٹی اور پراویڈنٹ فنڈ کا بھی معقول انتظام ہے۔

شیر سے انٹرویو کا وقت بلخ کے بعد۔ اڑھائی بجے سے ساڑھے چھ بجے تک۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد انٹرویو کے لئے آنا خطرہ سے خالی نہیں۔

انٹرویو کے لئے پانچ آدمی شیر سے ملنے گئے، شیر یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ ان پانچوں میں کوئی گیڈر نہ تھا، بھی انسان تھے۔

گیڈر کیوں نہیں آئے۔؟ شیر نے پوچھا۔

وہ سب کام پر لگے ہوئے ہیں۔ آدمی نے جواب دیا۔

تم کیوں آئے۔؟

اس لئے کہ ہم بے کار ہیں۔ دوسرا آدمی کرجھکا کے بولا۔

شہر میں ہمیں کوئی کام نہیں ملتا ہمارے بال بچے بھوکے مر رہے ہیں۔  
 ہمارے جنگل میں تو کوئی بیکار نہیں رہتا۔ شیر بولا۔ پھر  
 انسانوں کی لبتی میں لوگ بیکار کیوں رہتے ہیں؟ انسان تو اشرف  
 المخلوقات ہیں۔؟

اس سوال کا کسی آدمی نے جواب نہیں دیا۔ سب سر جھکائے  
 ہوئے خاموش کھڑے رہے۔

انسٹر ویکو کمیٹی میں شیر کے علاوہ غفلند اور چالاک  
 ریچھ بھی شامل تھا۔

ریچھ بولا۔ ان انسانوں کو واپس شہر میں بھیج دو۔ !  
 وہ لوگ چلانے لگے گرگڑانے لگے۔ ہمیں شہر میں واپس مت  
 بھیجو ہمیں جنگل میں کام دیدو ہمیں گیدڑ کا کام دیدو ہم خوشی سے  
 کریں گے۔

لوٹرا بولا۔ کام تم کو دیا جائیگا۔ مگر ایک شرط پر۔ تم  
 میں سے جو شخص بھی گیدڑ کا کام کرنے کا اہل ثابت نہ ہوا اسے شیر  
 کھا جائے گا۔

ہمیں منظور ہے، مگر کام ملنا چاہیے۔ آدمی بولے۔  
 پہلے دن جس آدمی کو گیدڑ کی ڈیوٹی سونپی گئی وہ سب سے



لائق تھا۔ اس کے پاس ایم۔ اے کی ڈگری تھی شیر نے گھڑی دیکھ کر اس سے کہا۔

اس وقت دس بجے ہیں۔ ایک بجے تک تم جنگل میں گھومو۔ اور دیکھو، میرے لئے خوراک کا بند و لیت کہاں ہو سکتا ہے۔ سراغ لے کر آؤ لچ سے پیلے۔

وہ آدمی حکم پا کر اسی وقت شیر کے لئے خوراک کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ گیا، نہ بچ گئے۔ بارہ بج گئے۔ ایک بج گیا۔ دو بج گئے۔ تین بج گئے۔ مگر وہ آدمی نہ آیا۔ شیر بھوکا کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا کوئی پانچ بجے کے قریب وہ آدمی بھاگا بھاگا آیا۔ اور اس نے شیر سے کہا۔

میں نے سراغ دگا لیا ہے۔ بہت عمدہ خوراک کا بند و لست ہوا ہے۔ چلئے۔ !

شیر نوکب سے بھوکا تھا، اسی وقت اس آدمی کے ساتھ چل پڑا، چلتے چلتے جنگل کے دشوار گزار راستوں سے گزرتے ہوئے وہ آدمی شیر کو درختوں سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی وادی میں لے گیا۔ جہاں ہری ہری لامبی لامبی گھاس لہلہا رہی تھی۔ کہاں ہے میرا شکار؟ شیر نے اس آدمی سے پوچھا۔



یہ کیا ہے۔ ! اس آدمی نے ہری گھاس کی طرف اشارہ کیا۔  
بے وقوف۔ شیر گرجا۔ تم نے کیا کھا کئے ایم۔ اے  
پاس کیا ہے۔

گھاس — وہ آدمی بولا۔ میں خالص ویکٹیرین ہوں  
اور میں نے علم نباتات (باٹنی) میں ایم۔ اے کیا ہے۔  
شیر کی دم غیض و غضب سے اونچی ہو گئی۔ احمق تمہیں  
یہ تک معلوم نہیں ہے کہ شیر گھاس نہیں کھاتا ہے۔ گوشت کھانا  
ہے۔ !

اس کے بعد شیر اس آدمی پر جھپٹا اور اسے کھا گیا۔

## دوسرے دن

دوسرے آدمی کی باری آئی جو گرہجو بیٹ تھا اور بے کاری  
سے پہلے اس نے ڈیڑھ سال تک ایسی فیکٹری میں کام کیا تھا جہاں  
سہیلوں کے مربے بنائے جاتے تھے۔ اس گرہجو بیٹ نے بھی تلاش بسیار  
کے بعد جنگلی سیبوں کے دوپٹے دریافت کر لئے اور شیر کو سیب  
کھلانے لے گیا۔ اور شیر نے جنگلی سیبوں کو کھانے کے بجائے اس  
آدمی کو کھایا۔

## تیسرا آدمی - !

میسر کو لیٹ تھا اور پہلے دونوں آدمیوں سے ہوشیار تھا۔ وہ بہت جلد شیر کے لئے شرکار ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ جنگل کی ایک گھنی گھاٹی پر اس نے ہرنوں کا ایک گتہ چرنے دیکھا اور فوراً بھاگا بھاگا آیا۔ اور شیر کو اطلاع کی شیر نے گھاٹی پر جا کر ہرن کا شرکار کر لیا۔ اور اطمینان سے بیٹھ کر کھانے لگا۔ خوب پیٹ سہم کر کھانے کے بعد شیر ایک طرف کو لیٹ گیا۔ اور بولا۔

لو — اب تم باقی جو بچا ہے اسے کھا لو۔

تیسرے آدمی نے انکار کر دیا۔ میں برہمن ہوں میں کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا۔

”اس پر شیر نے تیسرے آدمی کو بھی ختم کر دیا۔“

اب چوتھے کی بارسی آئی۔ !

## چوتھا آدمی - ۱

اس نے پہلے تین آدمیوں کی ناکامی سے سبق سیکھا۔ اس نے  
 نہ صرف شیر کے لئے شکار کا سراغ دگایا بلکہ خود شیر کا جھوٹا گوشت  
 بھی کھایا، حالانکہ کچّا تھا مگر اس نے بعد شکر کھا لیا۔ پھر شیر نے اہلینا  
 سے پاؤں پار کئے کہا۔

اب میرے بچے دابو۔

چوتھے آدمی نے بڑی محنت سے شیر کے بچے دانے شروع  
 کئے۔ شیر نے ایک ڈکار لی۔ پھر بولا۔

تم نے شکار کرتے وقت اس جیتے کی بیوی کو دیکھا تھا  
 جو ایک جھاڑی کے قریب کھڑی ہوئی مجھے گھور رہی تھی۔ جہاں میں  
 جاتا ہوں وہیں پہنچ جاتی ہے اور عجیب عجیب نگاہوں سے  
 مجھے لگتی ہے۔ میرا خیال ہے۔ مجھ پر عاشق ہے۔

کسی دوسرے کی بیوی کی طرف نگاہ اٹھانا گناہ ہے۔  
 چوتھا آدمی بولا۔ پھر میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ جتنی آپ پر  
 نہیں اپنا خاوند پر عاشق ہے۔ بڑی محبت سے اس کی

نہم جھوٹ بولتے ہو۔ شیر غمد سے گر جا وہ جتنی محمد پر عاشق

1-4

عاشق نہیں ہے ————— چوتھے آدمی نے اصرار کیا۔  
نتیجہ میں شیر اسے بھی کھا گیا۔

اب پانچویں کی بارسی آئی ۔ !

وہ آدمی بہت دہلا تھا اور ایک عرصہ سے فاقہ زدہ  
معلوم ہوتا تھا۔ بڑے تیز تیز قدموں سے سارے جنگل میں گھوم  
آیا مگر اسے اپنی مرضی کا کوئی شکار جنگل میں نہیں ملا۔ تو وہ  
شیر کو لے کر ایک جنگل کے کنارے ایک جھونپڑے میں لے گیا  
جہاں بہت سی سمیٹیں بکریاں بندھی تھیں۔ شیر نے چار،  
پانچ بکریوں کا شکار کیا اور جنگل میں لاکر اس نے دو بکرے  
بڑے مزے سے کھائے اور باقی تین بکریوں کی لاشوں کو اس نے

رات کے کھانے کے لئے رکھ دیا۔ شیر اس آدمی سے بہت خوش ہوا۔

رات کے کھانے پر شیر نے دیکھا کہ اس آدمی نے کچھ کپے  
نے بغیر اس کے پاؤں دابے شروع کر دیئے ہیں۔  
شیر نے پوچھا — ایسے لذیذ شرکار کا پتہ تم نے کیسے  
لگایا۔

شرکار — پانچواں آدمی ہاتھ جوڑ کے بولا۔ میں جب  
جنگل کو آ رہا تھا تو راستہ میں ایک رات میں نے اس چرواہے کے  
جھونپڑے میں گزار دی تھی۔ اور چرواہے نے مجھے رات کو بکری  
کا دودھ اور مکئی کی روٹی پیش کی تھی۔ اور ازراہ مہمان نوازی  
میں مکے پاؤں بھی دالے تھے۔

بہت خوب۔ شیر نے تعریفی نگاہوں سے اس کی طرف  
دیکھ کر کہا — تم احسان فراموش ہو۔ اس لئے بہت اچھے  
گیدڑ ثابت ہو سکتے ہو۔

حضور کی عنایت ہے۔ وہ آدمی پاؤں دابے ہوئے  
بولا۔ ورنہ میں کس لائق ہوں۔ آپ ایسا بہادر اور خوبصورت  
شیر ہیں آج تک نہیں دیکھا، سچ کہتا ہوں بڑے بڑے

جنگل گھوما ہوں مگر وہ وجاہت وقار اور دبدبہ جو آپ کی شخصیت میں ہے۔ میں نے کسی دوسرے شیر میں نہیں دیکھا۔ مروانہ حسن تو آپ پر ختم ہے۔

میں خوبصورت ہوں۔ ہا شیر نے پوچھا۔

مجھ سے کیا پوچھتے ہیں آپ۔۔۔ ذرا آپ نے اس حینتی کو دیکھا ہوگا جو آپ کے شکار کرتے وقت مسخوڑ لگا ہوں سے آپ کو دیکھ رہی تھی اور ایک حینتی پر کیا موقوف ہے۔ درخت پر سید کئے والی ایک حین و جمیل بندریا بھی پیٹر کی شاخ سے لپٹی لپٹی آپ کو دیکھ کر ٹھنڈی ٹھنڈی آپہں بھر رہی تھی اس ناچیسر و حقیر کا خیال تو یہ ہے کہ اس جنگل میں حینتی عورتیں ہیں سب آپ پر عاشق ہیں۔

شیر یا پتھوئیں آدمی کی باتیں سن کر بہت خوش ہوا۔ بولا۔ واقعی تم بہت اچھے گیدڑ ثابت ہو گے۔ بہت عمدہ آج سے میں تم کو اپنی ملازمت میں لیتا ہوں۔ اور تمہاری جان و مال کی ضمانت دیتا ہوں۔

اس آدمی نے شیر کا پاؤں چوم لیا۔

شیر بولا۔ ایک بات تباؤ تم اس سے پہلے کیا کرتے

تھے۔؟



اس آدمی نے سر جھبکا کے کہا۔  
حضور آپ کی ملازمت میں آنے سے پہلے میں  
ایک فلمی ہیرو کا چچہ تھا۔





# جانی واکراؤ شیر

(دوسری فلمی حکایت)



راوی روایت کرتا ہے کہ ایک قوم مشہور کا بیڈین جانی واکر  
 کو کسی فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے بھوپال کے جنگلوں میں جانا پڑا  
 یہ ایک زمین تارنجی تصویر تھی جس میں مشہور ہیر و شینیت کمار  
 بیڈنگ رول کر رہا تھا اور اس کے بالمقابل مس کھرچا ہیر وین  
 کا کام کر رہی تھی، جانی واکر نے پوڈیوس کو بتایا تھا کہ ٹرک کے  
 مناظر شوٹ کرنے کے لئے بھوپال کے جنگل بہترین ثابت ہوں گے۔  
 چنانچہ ایک دن پوڈیوس اپنی بیوی ہیر و اس کی  
 تین معشوقائیں ہیر وین اور اس کی دو اہلیں ایک سگی دوسری  
 سوتیلی، جانی واکر اور اس کی چار بند و قوں کو لے کر محلے قیلے  
 کے بھٹی سے روانہ ہوا۔ تین دن بھوپال میں رہنے کے بعد اور ناؤ  
 نوش کا مناسب انتظام کرنے کے بعد یہ قافلہ کھیدرواہ کے جنگلوں

کی طرف روانہ ہوا جہاں اوٹ ڈور شوٹنگ ہونے والی تھی۔  
 پہلا پڑاؤ کھید رواہ کے ڈاک بنگلہ اور ڈاک بنگلہ کے  
 باہر خیمے لگا کر کیا گیا۔ کھید رواہ کے ڈاک بنگلہ سے کھید رواہ کا جنگل  
 صرف دو پدم میل دور ہے۔ دشوار گزار پہاڑی علاقہ ہے اور  
 ڈاکوؤں اور شیروں سے بھر پور۔ شکار کے لئے آبیڈیل علاقہ  
 ہے۔ اور اسی اوٹ ڈور شوٹنگ کے لئے بھی جس میں وجینٹ کیا  
 مشہور ہیرو کو کیے بعد دیگرے تین شیروں کا شکار کرتے ہوئے دکھایا  
 جانے والا تھا کہ اس کی بہادری کا سکھ جتنا پر جم سکے۔

پروڈیو مرنے ہیرو کی اس بے مثل اور شاندار بہادری  
 کی شوٹنگ کرنے کے لئے ہر طرح کا انتظام کر رکھا تھا۔ تین بیٹیاں  
 شراب کی تھیں۔ ڈسکاری بھوپال کے تھے چھ توڑے دار بندوٹیں  
 تھیں اور بھالے ہیرو وکمان جو پرانے زمانے میں شکار میں استعمال  
 کئے جاتے تھے۔ وہ سب تھے، اس کے علاوہ اس نے بھوپال سے  
 دو ڈاکٹر بھی مرہم پٹی کے لئے تھے، اس کے علاوہ تین شیروں کی کھالوں  
 کو لے کر ان میں بھوسہ بھر دیا تھا اور اب یہ شیر بالکل اصلی لگ  
 رہے تھے۔ یہی وہ شیر تھے جن کا شکار ہیرو کو کرنا تھا۔ مگر جنگل  
 میں یعنی شیر نقلی ہوں گے مگر جنگل اصلی ہوگا۔



دوسرے دن عین آؤٹ ڈور شوٹنگ کے موقع پر ہیر نے  
جنگل میں جانے سے انکار کر دیا۔ بولا۔

”مجھے ان شیروں سے ڈر لگتا ہے۔“

”مگر یہ شیر تو نفلی ہیں۔ اور ان میں بھوسہ بھرا ہوا ہے۔“

جانی واکر نے ہیر کو سمجھایا۔ ”ان شیروں کو شکار کرنے  
میں کوئی ہرج نہیں ہے۔“

کیا معلوم بھئی۔ ہیر بولا۔ آخر شیر کی کھال ہے۔  
کس وقت غصہ میں آجائے۔

احتمق مت بنو۔ جانی واکر بولا۔ سیدھے سیدھے  
شوٹنگ کو چلو تمہاری حفاظت کا ہر طرح سے بندوبست کر دیا گیا ہے۔  
ہیر جانے پر راضی ہوا تو گھوڑے دیکھ کر بولا۔  
میں ان گھوڑوں پر نہیں چڑھ سکتا۔ یہ تو بالکل اعلیٰ گھوڑے معلوم  
ہوتے ہیں۔

ہاں۔ اعلیٰ تو ہیں۔ جانی واکر بولا۔

کہیں میں گر گیا تو۔ ہیر بولا۔ وہ بے چارے

شیام کا قصہ تو تمہیں معلوم ہے۔ جو شوٹنگ کے دوران میں گھوڑے  
سے گر کر مر گیا تھا۔ ناں بھئی میں اعلیٰ گھوڑے پر نہیں بیٹھونگا۔

پر ڈیو سرنے اپنا سر پیٹ لیا۔ اب میں نقلی گھوڑے کہاں سے لاؤں۔ جن کی کھال میں شیر کی کھال کی طرح بھوسہ بھر دیا گیا ہو اگر کسی طرح سے ہم بھی پہنچاؤں تو ایسا گھوڑا چلے گا نہیں۔ جانی وا کر بولا۔ ایک کام تم کر سکتے ہو اپنی کھال میں بھوسہ بھر لو اور ہیر و کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر جنگل میں لے چلو۔ مذاق مت کرو جانی بھائی۔ وہ میرا فلم فنانسر پہلے ہی سے میری کھال میں بہت بھوسہ بھر چکا ہے۔

آخر یہ طے کیا گیا کہ ہیر و کی جگہ ایک ڈبل کو استعمال کیا جائے یعنی ایک ایسا آدمی جس کی شکل و صورت ہیر و سے ملتی جلتی ہو اور جو اصلی گھوڑے پر چڑھنے سے انکار نہ کرے۔ مگر نہ کیب میں ایسا کوئی آدمی تھا نہ بھوپال میں۔ بڑی مشکل سے بیٹی سے ایک ڈبل منگایا گیا اور آؤٹ ڈور شوٹنگ شروع کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ مگر اب ایک اور مشکل پیش آئی۔ ہیر و ڈاک بنگلہ میں اکیدا رہنے کو تیار نہ تھا۔ چنانچہ اس کی حفاظت کے لئے دو شکاری ڈاک بنگلے میں چھوڑ دیئے گئے۔ اور پر ڈیو سرنے ہیر و کے ڈبل کو لیجا کر کھیدرواہ کے جنگل میں شوٹنگ شروع کی اور تین دن کی زبردست شوٹنگ کے دوران میں تینوں بھوسہ بھرے ہوئے شیر شکار کر لئے۔

چوتھے دن ایک کامیٹری سین تھا جس میں یہ دکھایا گیا تھا۔  
 کہ ہیرو کے دربار کے مسخرے (جانی واکر کو یہ پارٹ کرنا تھا) کی اچانک  
 اسی شکار کے دوران میں ایک شیر سے ٹھو بھڑ ہو جاتی ہے۔ اور اس  
 وقت جانی واکر بالکل نہٹا ہے اور شیر بالکل سر پہ آن پہنچا ہے۔  
 اس وقت جانی واکر اپنی اداکاری کے کمال دکھاتا ہے۔ اور شیر  
 کو اتنا ہنساتا ہے کہ شیر ہنستے ہنستے مر جاتا ہے۔

اس سین میں جانی واکر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس درجہ  
 اپنے کمالات کا فن دکھائے گا کہ فلم دیکھنے والے اگر ہنستے ہنستے مرنگے  
 نہیں تو پیٹ بک کر لوٹ لوٹ ضرور ہو جائیں گے۔

سین شروع ہوا جنگل میں بھوسہ بھرا ہوا شیر رکھ دیا گیا  
 اس کا منہ اس طرح کھلا تھا جیسے شیر واقعی ہنس رہا ہو۔ جانی واکر نے  
 اپنے کمالات دکھانے شروع کئے۔ کیمرا چلنے لگا۔

یہ ایک ایک زور کی دھاڑ سنائی دی اور دوسرے لمحہ  
 میں لوگوں نے دیکھا کہ گھنے جنگل کے اندر سے واقعی ایک شیر سچے سچ  
 کا شیر دھاڑتا ہوا جانی واکر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

چاروں طرف بھگدڑ مچ گئی کیمرا کیمرا چھوڑ کر سب لوگ  
 ادھر ادھر تشر متبر ہو گئے اور درختوں پر جا چڑھے، صرف جانی واکر

اکیلا رہ گیا کیوں کہ اس کی پیٹھ اصلی شیر کی طرف تھی۔ اور وہ نقلی شیر کو خوش کر کے ہنسنا ہاستھا۔

جب جانی واکر مڑا تو اس نے اپنے سامنے اصلی شیر کو منہ کھولے نیچے پھیلائے غراتے ہوئے دیکھا۔

اب ہنسناؤ مجھے۔ اصلی شیر نے جانی واکر سے کہا۔

جانی واکر کے کاٹو تو خون نہیں، یہ حال تھا اس کا۔

ہاں، ہاں..... ہنسناؤ اصلی شیر بولا۔ میں تمہیں ہنسنا

کے لئے ڈومٹ دیتا ہوں اگر تم مجھے ہنسا کے تو جان بخش دوں گا۔

ورنہ کھا جاؤں گا۔

جانی واکر چپ چاپ دم بخود کھڑا رہا، ایک منٹ گزر

گیا۔ دوسرا منٹ گزر گیا۔

شیر بولا۔ "مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ جانی واکر۔"

درختوں پر چڑھ سب لوگ دم سادھے جانی واکر اور

شیر کو دیکھ رہے تھے۔

جانی واکر نے کہا۔ "مجھے کھانے سے پہلے میری ایک

بات سن لو۔"

سنناؤ۔ شیر نے وہیں سے گرج کر کہا۔

وہ بات کان میں بتانے کی ہے۔ جانی وا کر نے شیر سے کہا۔  
 شیر جانی وا کر کے قریب آیا۔ جانی وا کر نے جھک کر شیر  
 کے کان میں کچھ کہا۔ سنتے ہی شیر نے منہ کھیسر لیا اور دوڑتا ہوا  
 جنگل کے اندر غائب ہو گیا۔

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا پھر جانی وا کر نے درخت پر  
 چڑھے آدمیوں سے کہا۔ ”اُتر آؤ نیچے اُتر آؤ۔ شیر اب یہاں  
 نہیں آئے گا۔“

”وا ایک آہستہ آہستہ ذکر کے سب لوگ درخت سے  
 نیچے اُتر آئے۔ سب لوگ جانی وا کر کے گرد اکٹھا ہو گئے۔ پڑویوں  
 نے اس سے کہا۔“

آخر تم نے شیر کے کان میں ایسی کون سی بات کہی تھی جسے  
 سنتے ہی وہ دم دبا کر سہاگ گیا۔

جانی وا کر مسکرا کر بولا۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا۔  
 ”میاں شیر خان میں جانی وا کر نہیں ہوں۔ میں اصل میں ایک  
 اہم میکیں آفیسر ہوں۔“





پتھی

اور

سن سن

تیسری فلمی حکایت



## ہاتھی اور ٹن ٹن !

ایک دفعہ کا ذکر ہے . ایک جنگل کا راجہ ہاتھی تھا کیونکہ اس جنگل میں ہاتھیوں کا گڑ بہت بڑا اور مضبوط تھا اور اس جنگل میں کوئی شیر نہیں تھا۔ اور جنگل میں جتنے بھیڑیے ، گیدڑ ، اور ریچھ تھے سب ہاتھیوں سے ڈرتے تھے — ہاتھیوں کے راجہ کا نام من من تھا۔ وہ بہت بڑا قوی ہیکل اور بدست ہاتھی تھا۔ سبھی ہاتھی اسکی سرداری قبول کرتے تھے اور جنگل کا کوئی خونخوار سے خونخوار جانور اس کے سامنے چوں نہیں کر سکتا تھا۔ !

من من اپنے ہاتھیوں کے گیلے کو لیکر جدھر چاہے نکل جاتا۔ ہری ہری دوب کو چرتا تھا۔ بالنس کی نازک ڈالہیوں کو توڑ کر چباتا۔ ان کی بیٹی بیٹی مزے دار جڑیں کھود کھود کر کھاتا۔ جھیل

سارے جنگل کا راجہ تھا اور اسے کوئی روکنے والا نہ تھا۔ !  
ہاتھیوں کے گٹے میں کی بہت سی ہتھنیاں اس پر فرائضیں  
مگر من من ابھی تک کنوارا تھا۔ اس نے ابھی تک کسی ہتھنی کو دل نہیں  
دیا تھا۔ ہتھنیاں اسے ہزاروں ناز و عشوے دکھاتیں مگر من من کا  
دل کسی ہتھنی پر آیا۔

ان ہتھنیوں میں ایک ہتھنی کہ سب سے سداورد و لکش تھی۔  
اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی بے حد چمکتی ہوئی۔ سونڈ، مخروطی اور مشوفا  
وہ چھیل چھیلی گج گامنی جب کو لے ٹسکانے ہوئے چلتی تھی تو سیکڑوں  
ہاتھیوں کے دل دوڑنے لگتے تھے۔ ! مگر یہ ہتھنی کسی کو خاطر میں نہیں  
لاتی تھی۔ کیونکہ یہ ہتھنی اپنے سردار پر عاشق تھی۔ اس ہتھنی کا نام سن  
گن تھا۔ وہ ہر وقت یہی کوشش کرتی کہ اپنے سردار کے پیچھے پیچھے  
چلے۔ ! من من کو سن گن پر غصہ آتا تھا تو سونڈ اٹھا کر  
اسے پیٹ ڈالتا تھا۔ مگر مار کھا کر بھی سن گن کچھ نہ کہتی ٹھنڈی  
ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی من من کے پیچھے پیچھے چلنے لگتی۔ !

دوسرے ہاتھیوں کو سن گن کے عشق کو دیکھ کر بہت  
رحم آیا۔ انہوں نے پنچایت کی۔ پنچایت نے فیصلہ کیا کہ سن گن  
ہر لحاظ سے سردار کی بیوی بننے کے لائق ہے۔ اور یہ کہ راجہ کا اتنی

تک کنوارا رہنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ چنانچہ طے پایا کہ اگلے ہفتے گنیش چودش کے سترک تیو ہار پر من من اور سن گن کی شادی کر دی جائے۔ فیصلہ چونکہ پنچایت کا تھا اور ہاتھی پنچایت کو بہت مانتے ہیں۔ اس لئے من من نے سر جھٹکا کہ پنچایت کے فیصلے کو منظور کر لیا۔

اسی جنگل کے کنارے دیونگر نام کا ایک چھوٹا سا قصبہ

آباد تھا۔

گنیش چودش کے پوتر تیو ہار کے موقع پر اس قصبے کے لوگوں نے ایک ہفتے کے لئے ایک ٹورنگ سینما کو بلایا۔ قصبے سے باہر، جنگل کے کنارے چوپال میں دو دو آنے کا ٹکٹ لے کر قصبہ کے مرد، عورتیں، بچے بالے بوڑھے سبھی جمع ہوئے اور ایک بڑے اونچے پردے پر چلتی پھرتی تصویروں کو جو بولتی اور گاتی تھیں دیکھ کر خوش ہوئے۔

ہوتے ہوتے ہاتھیوں کو بھی اس کی خبر ملی۔ من من کہ اپنی من مانی کرنے والا تھا، دوسرے ہاتھیوں کی صلاح نہ مان کر بھی سینما دیکھنے چلا گیا۔ اور جب وہاں سے لوٹا تو اس کے آنکھوں کی چمک غائب تھی۔ اس کے چہاج ایسے کان بڑی ادا سی سے لٹکے ہوئے تھے۔

اور وہ رہ کر ٹھنڈی سالنیں بھرتا تھا۔ !

”کیا ہوا — ؟“ ایک ہاتھی نے من من سے پوچھا۔

”مجھے عشق ہو گیا ہے۔ !“

”کس سے — ؟“

”ٹن ٹن سے۔ !“ من من نے کہا۔

”ٹن ٹن کون ہے۔ ؟“

”ایک فلم ایکسپریس ہے۔ !“

”کیا مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ ؟“ سن گن نے پوچھا۔

”ہمارے گلے میں کوئی ایسی تھنی نہیں ہے جو خوبصورتی

میں ٹن ٹن کا مقابلہ کر سکے۔“ من من ایک سرد آہ کھینچ کر بولا۔ ”میں

تو دیوانہ ہو چلا ہوں۔ اس کے عشق میں — کیا نازک کر ہے۔ اس کی

کیا لوج ہے اس کے بدن میں۔ کس ادا سے وہ جھولتی ہوئی چلتی ہے۔

کیا چنگھاڑ ہے اس کی آواز میں کہ شیر بھی سنے تو اس کا سینہ دہل

جائے — دیکھو۔ میں تمہارا راجہ۔ تم سے صاف صاف

کہے دیتا ہوں۔ اگر میں شادی کروں گا تو ٹن ٹن سے۔ نہیں تو سارے

عمر کنوارا رہوں گا۔ !“

سن گن نے یہ سن کر اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ سو نہ راجہ



کے قدموں میں ڈال دی۔ مگر راجہ کا دل کسی طرح نہ لیجا۔ سن گن  
کی شادی ملتوی کر دی گئی۔ !

پورے سات دن من من راجہ سینما دیکھنے جاتا رہا۔ اور  
جوں جوں وہ ٹن ٹن کو دیکھتا جاتا تھا۔ توں توں اس پر زیادہ سے  
زیادہ عاشق ہوتا جاتا تھا۔ ٹن ٹن کے عشق میں بد حال ہو کر اسے  
کھانا پینا بھی چھوڑ دیا۔ اب وہ دن رات آپیں بھرتا تھا۔ اور ا  
ٹپھتا تھا۔ !

اس کی حالت دیکھ کر ہاتھیوں نے پنچایت بلائی اور  
کیا کہ سن گن کے بجائے ٹن ٹن کی شادی راجہ سے کر دی جائے۔  
راجہ من من پنچایت کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوا۔ !  
پنچایت نے طے کیا کہ اب کے وہ سب مل کر راجہ من من  
کے ساتھ سینما دیکھنے جائیں گے اور ٹن ٹن کو اٹھالائیں گے اور  
جینگل میں لا کر من من سے اس کی شادی رچا دیں گے۔ !

شادی کا سب بندوبست ٹھیک کر کے ہاتھیوں کا گھ  
سینما دیکھنے روانہ ہوا۔ انہوں نے دیونگر کی چوپال کو چاروں  
طرف سے گھیر لیا اور جو نہی سینما کے پردے پر ٹن ٹن دکھائی دی  
وہ چیخے چنگھاڑتے آگے بڑھے۔ لوگ ہاتھیوں کو آتے دیکھ کر

بھاگ گئے۔ ہاتھیوں نے سوٹا اٹھا کر پردے کو چاروں طرف سے پکڑ کر لکڑی کے کھنبوں سے اکھڑ لیا اور اسے لے کر بھاگتے ہوئے جنگل میں گھس گئے۔

جنگل میں جا کر دیکھا۔ تو پردہ خالی تھا۔ اور جگہ جگہ سے چھپا ہوا۔ ٹن ٹن غائب تھی۔ خالی ایک پردہ تھا۔

ایک بڑھا ہاتھی بولا۔ "دیکھا بیٹا من من — یہ ہے فلمی عشق کا انجام۔ فلمی عشق محض ہوائی ہوتا ہے۔ آخر میں صرف ایک پردہ رہ جاتا ہے۔"

"بہتر یہی ہے۔" دوسرا بڑھا ہاتھی بولا۔ "کہ تو اس عشق سے توبہ کرنے اور بیدھے بیدھے سن گن سے شادی کر لی۔ اب اس کے دو بچے ہیں۔ وہ اپنے جنگل کا راجہ ہے اور بڑے مزے سے اپنے جنگل میں سرداری کرتا ہے۔"





”  
یگماک

اور

”  
کبیل!

(چوتھی فلمی حکایت)

## لیکھک اور کبیل !

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ بمبئی کی ایک مشہور فلم کمپنی ،  
مالیہ کے اونچے جنٹلوں میں آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے گئی۔ وہاں  
فلمی لیکھک کا کبیل کھو گیا۔۔۔ رات بھر فلمی لیکھک اپنے خیمے  
میں سردی سے ٹھٹھرتا رہا۔ اور کبیل چرانے والے کو دل ہی دل  
میں گالیاں دیتا رہا۔۔۔ کبھی تو چور کو گالیاں دیتا۔۔۔ کبھی فلم  
پر دڈیو سر کو جس نے فلم کی کہانی ہالی ووڈ کی مشہور فلم سے چرائی تھی۔  
اور اب اسے لیکھک کے نام منڈھ رہا تھا۔ کبھی ہیرو کو جو لیکھک  
کی جگہ خود ڈائیلاگ لکھنے پر مقرر تھا۔۔۔ کبھی ہیروین اور کبھی کا میڈین  
کو کوستا۔۔۔ جو اس کے خوبصورت فلمی مناظر کا تیا پانچ کرنے





شوٹنگ کے دوران میں اس نے ندی کے تیر بہتے ہوئے پانیوں میں ایک بھورے نہرے رنگ کے کبل کو تیرتے دیکھا — سہیرو کو وہ کبل بہت پسند آیا۔ بولا۔

”کتنا خوبصورت کبل ہے۔ اگر کسی طرح سے مجھے مل جاتا۔۔۔۔۔!“

حالانکہ سر دی بہت تیر تھی اور لیکھک جاتا تھا کہ بہاڑی ندی کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہو گا — پھر بھی وہ سہیرو کو خوش کرنے کے لئے اور کبل حاصل کرنے کے لئے ندی میں چھلانگ لگا گیا — اسے تیرنا غرور آتا تھا — مگر ایک تو ندی کا پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ دوسرے بہاڑی بہت تیر تھا — اس لئے اس نے کئی ڈبکیاں کھائیں — آخر وہ کبل کے قریب پہنچ گیا۔ اور اس نے بڑی مشینوٹی سے کبل کو پکڑ لیا۔

کبل کو پکڑنے کے بعد کنارے پر کھڑے لوگوں نے دیکھا کہ لیکھک پہلے سے بھی زیادہ ڈبکیاں کھا رہا ہے — سہیرو نے کنارے سے چلا کے کہا۔

”کبل چھوڑ دو۔ اور کنارے پر آ جاؤ۔“

لیکھک منجھڑھار میں ڈبکیاں کھاتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔

”میں تو کبل کو چھوڑتا ہوں — مگر کبل مجھے نہیں چھوڑتا۔“  
 اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ کبل دراصل کبل نہیں  
 تھا۔ ایک پہاڑی ریچھ تھا جو ندی میں نہا رہا تھا۔  
 ریچھ نے فلمی لیکھک کو کپڑا لیا۔ اور جوں جوں فلمی لیکھک  
 اپنی جان چھڑانے کی کوشش کرتا ریچھ اتنی ہی مہینو ملی سے  
 جکڑ لیتا۔ آخر تھک ہار کر فلمی لیکھک نے اپنے آپ کو ریچھ  
 کے حوالے کر دیا۔ اور ریچھ تیرتا ہوا ندی کو پار کر کے — فلمی  
 لیکھک کو اٹھائے ہوئے۔ پہاڑی کے دوسری طرف جنگل میں  
 غائب ہو گیا۔

ریچھ نے لیکھک کو اپنے بھٹ کے اندر بچھے ہوئے  
 گھاس پھونس پر پھینک دیا۔ اس نے لیکھک سے کہا  
 کہ وہ اپنے کپڑے اتار دے۔ لیکھک نے ڈرتے ڈرتے اپنے  
 کپڑے اتارے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ جانے اب ریچھ اس  
 سے کیا سلوک کرے گا۔ .... ؟

ریچھ اس کے کپڑے اٹھا کر بھٹ کے باہر چلا گیا۔ اور  
 انہیں دھوپ میں سکھانے لگا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب ریچھ  
 واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بہت سے جنگلی پھل تھے۔

لیکھک کو بہت بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے پیٹ بھر کے جنگلی پھل کھائے۔ پھر ریچھ نے اس کے کپڑے سکھا کر اسے واپس کئے اور اس سے کہا۔

”نوراً کپڑے پہن لو۔ اور میرے ساتھ باہر چلو۔!“  
 لیکھک کپڑے پہن کر ریچھ کے ساتھ روانہ ہوا۔  
 چلتے چلتے دونوں شیر کے دربار میں پہنچ گئے۔  
 لیکھک نے جھک کر سات بار شیر کو سلام کیا۔ شیر نے دم ہلا کر اس کے سلام کا جواب دیا بولا۔  
 ”اے فلمی لیکھک تجھے معلوم ہے ہم نے تجھے کیوں یاد کیا ہے۔؟“

”نیل سبحانی۔“ فلمی لیکھک بولا۔ ”یہ خاک سارا اپنی با واقفیت کے اٹھارہ پر مجبور ہے۔ بادشاہ سلامت ارشاد فرمادیں۔ تو کچھ تہہ چلے۔!“

”ہم ایک فلم بنانا چاہتے ہیں۔“ جانوروں کا مغل اعظم۔ ”ٹھائی گئے عرا کر بولا۔

”اس دمہا السنو فلم کو میں ڈائریکٹ کروں گا۔“ ریچھ نے اپنے سر کے بال جھلاتے ہوئے کہا۔

لوٹرا جنگل کے جانوروں میں سب سے چالاک ہوتا ہے۔

بولا۔

”میں اس تصویر کا پروڈیوسر رہوں گا۔ آجکل فلم کا زمانہ ہے۔۔۔ ساری دنیا کے انسان فلم دیکھتے ہیں۔ تو جانوروں کی بھی فلمیں۔۔۔ ہم جنگلی جانوروں نے فیملی کیا ہے کہ ہم بھی اپنی فلم کمپنی کھڑی کریں گے اور دھڑا دھڑا پچھپچھپائیں گے۔ جو ہماری جگہ جنگلوں میں دکھائی جائیں گی۔ ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے۔ بس ایک فلمی لیکچر کی کمی تھی۔!“

لیکچر نے قدمبوسی کی اور بولا۔ ”میں حاضر ہوں بادشاہ سلامت مگر فلم کے کام میں مختلف طرح کے ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سامان کے بغیر فلم نہیں بن سکتی۔

”ہم سب جانتے ہیں۔۔۔“ بشر نے گرج کر کہا اور ایک بھیڑیے کو حکم دیا۔۔۔ ”جاؤ۔۔۔ فلمی لیکچر کو سامنے کے غار میں لے جاؤ۔!“

لیکچر تھرتھہر کانپنے لگا۔۔۔ بھیڑیے کے تیز نیزہ دانت دیکھ کر اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔۔۔ مگر مزہ کیا نہ کرتا۔ چپ چاپ بھیڑیے کے ساتھ غار کے اندر چلا گیا۔

ایک فلمی اسٹوڈیو میں ہوتا ہے — وہ سب یہاں پر موجود  
ہے — !

جو باقی بچے انہیں ہم نے کہا لیا۔ اس وقت سے یہ  
سارا سہ امان بیہیں پڑا ہے۔

بھڑی نے لیکھک کو سارا سامان دکھایا۔ پھر اسے  
لیکھ نما سے باہر آگیا۔ اور بادشاہ سلامت کے حضور  
میں لیکھک کو دوبارہ پیش کر دیا۔



"تمہارا اطمینان ہو گیا — ؛" شیر نے لیکھک سے

پوچھا۔

"ہو گیا سرکار والا مدرا۔"

"تو پھر دیکس بات کی ہے۔" کہا لی لکھو۔

"لکھتا ہوں۔ مگر کچھ مہلت چاہیے۔"

شیر نے لومڑے سے مشورہ کیا۔ لومڑے نے رکیچھ سے

رکیچھ نے سمجھائیے سے۔ سمجھائیے نے کہا۔

"تمہیں دو دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ دو دن

میں اگر کہانی تیار نہ ہوئی تو بادشاہ سلامت تمہیں کہا جائیں گے۔

—!!"

لیکھک نے مسکرا کر کہا۔ "دو دن تو بہت ہوتے

ہیں۔ ہمارے غلمی پر دو سو سو چار گھنٹے میں کہانی مانگتے ہیں۔

—!

شیر نے دربار پر خاست کرتے ہوئے کہا۔

"مابدولت تمام کے شرکار کو جاتے ہیں۔ دربار

پر خواست،

شیر جب انہی جگہ سے اٹھا تو گیدڑ



زور سے چپٹا کر بولا۔

”بہ ادب یہ ملاحظہ ہو شہیار !  
بادشاہ سلامت شکار کو جاتے ہیں۔  
بہ ادب یہ ملاحظہ ہو شہیار۔“



”اسی دن شام کے وقت ریچھو کے بھٹ میں جنگل کے  
جانوروں کی ایک بے ضابطہ میٹنگ ہوئی۔۔۔ یہ میٹنگ  
قلمی لیکھک کے کہنے پر بلائی گئی تھی۔“

”بہنو اور بھائیو !“ قلمی لیکھک نے اپنا عندیہ  
ظاہر کرتے ہوئے کہا۔۔۔ ”آپ نے جو کام مجھے سونپا ہے۔  
میں اسے پوری طرح سے اور ٹھیک طرح سے انجام دینے  
کی کوشش کروں گا۔ مگر کچھ مسائل ایسے ہیں۔ جن پر آپ  
سب کامل کر غور کرنا ضروری ہے۔۔۔ سب سے مشکل بات  
روپے کی ہے۔ جنگل کی تصویر بھی بغیر روپے کے نہیں بن  
سکتی۔۔۔“

"ہمارے پاس روپیہ بہت ہے۔" ناگ پھنکارتے ہوئے بولا۔

"اس جنگل میں سات بادشاہوں کا خزانہ دفن ہے اور وہ سارا خزانہ میری تحویل میں ہے۔ تمہیں جتنے چاہیں۔ میں سونے کی اشرفیوں کی صورت میں دے سکتا ہوں۔" یہ خبر سن کر لیکھک کا دماغ باغ باغ ہو گیا۔ "یہ تو بہت اچھی خبر سنا لی آپ نے۔" لیکھک بولا۔

"میرے خیال میں اب کاسٹنگ ہو جائے تو اچھا ہے۔ بادشاہ کا رول تو غالباً بادشاہ سلامت خود کریں گے۔ لیکن ان کے ولی عہد یعنی ہیرود کا رول کون کریگا۔" ریچھ بولا۔ "میں کروں گا اور کون کریگا۔" لیکھک نے ریچھ کی صورت دیکھی۔ ریچھ نے مسکراتے ہوئے اپنے خوفناک دانت دکھائے۔

لیکھک نے اسی وقت ہنسنے کہا۔ "ہاں ٹھیک

ہے۔۔۔ اب ایک کامیڈین چاہیے۔!“

لنگور بولا۔۔۔ ”میں خانہ بھوں۔۔۔ مجھ سے اچھا کامیڈین آپ کو فلم انڈسٹری میں نہیں ملے گا۔۔۔ اچھل کود میں جالنی واکر کو مات کر دوں گا۔ منہ نبالنے میں آغا کو اور باتیں کرنے میں اوم پرکاش کو۔۔۔ ذرا کام دے کے دیکھئے۔۔۔۔۔!“

”چلتے آپ کامیڈین۔۔۔۔۔“ لیکھک بولا۔ ”اب بتائیے کہ میوزک ڈائریکٹر کون ہوگا۔؟“

لومڑا بولا۔۔۔ ”میں میوزک ڈائریکٹر۔!“

گیدڑ بولا۔۔۔ ”نہیں۔ میں میوزک ڈائریکٹر۔!“

دونوں میں کافی دیر تک جھگڑا ہوتا رہا۔ آخر لیکھک نے کہا۔ ”کیوں نہ آپ دونوں مل کر میوزک دیں۔؟ آجکل فلمی میوزک میں جوڑی بہت چلتی ہے۔ جیسے شنکر، جے کشن۔ آندھی۔ کلیان جی۔ لکشمی کانت۔ پیارے لال۔ اپنی ہرچہر کے لئے“

”لومڑا گیدڑ بہت عمدہ اور بہت اچھے رہیں گے۔!“

لومڑا، گیدڑ، میوزک ڈائریکٹر ملے ہوئے۔۔۔

باقی کا سٹنگ بھی آسانی سے ملے ہوئے۔

دیکھ بولا۔

"اور تو سب ٹھیک ہے۔ ہمارے جنگل میں کوئی ہیروئن

نہیں ہے۔!"

"ہاں۔" لیکھک سوچ سوچ کر بولا۔ "ہیروئن

کا بڑا لفظ ہے۔" کئی نام تجویز ہوئے۔ "ریجنی، گینڈی۔  
بھیڑنی۔ مگر ریجنی نے سب نام رد کر دیئے۔

"واقعی۔" لیکھک بولا۔ "ہیروئن کا بڑا

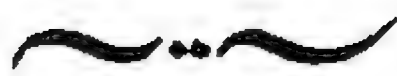
لفظ ہے۔ میں سمجھتا ہوں مگر اس جنگلی کچر میں ایک عورت ہیروئن  
آجائے تو مزہ آجائے پھر یہ کچر نہ صرف جنگل میں بلکہ شہروں میں بھی  
باکس آفس پر ہٹ ثابت ہوگی۔!"

ریجنی نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ "بات تو تم ٹھیک

کہتے ہو۔ مگر وہ کون عورت ہوگی جو ہمارے جانوروں کے سنگ  
کام کرنے پر راضی ہوگی۔!"

"سوچنا پڑے گا۔" لیکھک بولا۔ "رات بھر

کے لئے سوچنے کا ٹائم دو۔!"



دوسرے دن جب لیکھک ریچھ کے بھٹ میں سے سو کر باہر  
 نکلا تو دیکھا کہ سامنے سے ریچھ آوٹا اور شوٹنگ کرنے  
 والی کمپنی کی ہیروین مس چنچلا کو کندھے پر اٹھائے چلا آ رہا ہے۔  
 لیکھک چنچلا کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ایک عرصہ سے  
 لیکھک کی اس پر آنکھ تھی۔ مگر چنچلا تھی کہ اسے خاطر میں  
 بھی نہ لاتی تھی۔ چنچلا فلم انڈسٹری کی حسین ترین فلم ایکٹر  
 میں تھی۔ نازک بدن۔ زہریلے خم۔ آتشیں تبسم  
 ۔۔۔۔۔ انگ سے جوانی پھوٹتی ہوئی۔۔۔۔۔ مست۔۔۔۔۔  
 شوخ۔۔۔۔۔ دلکش اور چنچلا کب سے لیکھک کے دل میں بسی  
 ہوئی تھی۔۔۔۔۔ مگر لیکھک کی کبھی ہمت نہ ہوئی تھی کہ اس سے  
 اپنے دل کی بات کہہ سکے۔۔۔۔۔ فلم کمپنی میں وہ اونچی فضاؤں  
 میں اڑتی تھی۔۔۔۔۔ کبھی ہیرو کے ساتھ، کبھی پروڈیوسر  
 کے ساتھ۔۔۔۔۔ کبھی ڈائریکٹر کے ساتھ۔۔۔۔۔ بیچارے فلمی  
 لیکھک کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں کیا تھا۔



”تو تمہارا مہیروئن والا مسد بھی حل ہو گیا۔“  
 رچھو ہا ہنپتے ہوئے بولا۔ ”بڑی مشکل سے اغوا کر کے لایا ہوں۔“  
 —!

دو دن کے بعد کہانی پر بحث ہوئی۔ ”کہانی کیسٹی“  
 میں رچھو، لومڑا۔ گبڈ۔ چنچلا اور سنگور کے علاوہ خود بادشاہ  
 سلامت بھی شریک تھے۔!

”کیا تبدیلی کہانی لکھی ہے تم نے۔“ شیر بولا۔  
 ”بادشاہ انارکلی کو دیوار میں کیوں چنوا دیتا ہے۔؟ اسے خود  
 کیوں نہیں کھایا۔؟“

لیکھک نے عرض کی۔ ”حضور پر نور۔ فلم میں مہیروئن  
 کو کھایا نہیں جاتا۔ یہ بات فلمی اصول کے خلاف ہے!“  
 ”اچھا۔۔۔ اگر بادشاہ نہیں کھاتا تو اس کا بیٹا ہی  
 کھا جائے۔۔۔ مہیروئن بیکار میں ماری جا رہی ہے۔  
 ایسے شکار کا کیا فائدہ۔؟“ بادشاہ نے پھر کہا۔

رچھو بولا۔ ”اور ولی عہد کیا نبردل ہے۔؟“

انارکلی کے لئے وقتا کیوں ہے۔؟  
 اپنے باپ سے لڑ کر انارکلی کو حاصل کیوں نہیں کرتی؟



دونوں لڑیں۔ شبر بھی اور بچہ بھی۔ جو جیت جائے وہ انارکلی کو حاصل کر لے۔“

لومڑا گبڑ بولے۔ ”اس کہانی میں تو میوٹرک کا اسکوپ بھی نہیں ہے۔ ڈائلاگ ہی ڈائلاگ رکھ دیئے ہیں۔“

لنگور بولا۔ ”اور میری کامیڈی کے سین بھی بہت کم ہیں۔ اور وہ سین بھی تمہیں بدلنا پڑے گا۔۔۔۔۔۔“

”کون سا۔؟“ نیکھک نے پوچھا۔

وہ جس میں انارکلی بال کھولے، شہزادہ، شہزادہ کہتی ہوئی جنگل میں بھاگی جا رہی ہے۔ اس وقت یہ دکھاؤ کہ لنگور دو درختوں سے پھدکتا ہوا آتا ہے۔ اور انارکلی کو اس کے بالوں سے پکڑ کر اوپر درخت کی شاخوں میں گھس جاتا ہے۔ اور شہزادہ نیچے منہ دیکھتا رہ گیا۔“

”اور عین اسی وقت ایک دوپٹ شروع ہو جاتا

ہے۔“ لومڑا بولا۔

”میں کا شہسیر کی خور۔“ تو جنگل کا لنگور۔

چشم بد دور۔“

"واہ - واہ ، گیدڑ نے واہ دی —" کیا مکھڑا

ہوا ہے ، مکھڑا ہے کہ چاند کا مکھڑا ہے ۔ !"

رچھو پھر لیکھک سے مڑ کر کہنے لگا ۔ " بھائی لیکھک

تم سے یہ کہانی نہیں بنے گی — اس کہانی کو میں لکھتا ہوں ۔ چنچلا

لومڑ اور گیدڑ ، کی مدد سے — مگر گھبراؤ نہیں —

نام تمہارا ہی جائے گا ۔ !"

لیکھک کا منہ اتنا سا نکل آیا — مگر خون کا گھونٹ پی

چپ ہو رہا — کہانی کا اسکرپٹ اس نے رچھو کے حوالے کیا

اور خود جنگل میں ہوا کھانے کو نکل گیا ۔ !"

رات کو اس نے چنچلا سے بات کی ۔ " میں نے آج اس

جنگل میں سے نکلنے کا راستہ دریافت کر لیا ہے — خبردار

رہو — میں آدھی رات کو جب سب پہرے دار جانور

سو جائیں گے ۔ تم کو جگنا دوں گا — پھر ہم دونوں اس جنگل

سے بھاگ جائیں گے ۔ !"

" کون تم سے بھاگ جانے کی بات کر رہا ہے — ؟"

چنچلا تنک کر بولی ۔

" کیا تم اس جنگل میں رہنا پسند کرو گی ۔ ؟" لیکھک

نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا برائی ہے۔؟ اور مجھے یہاں شہداء اور دودھ ملتا ہے۔ تازے تازے عمدہ پھل ریچھ میرے لئے توڑ کر لاتا ہے۔ اور خوبصورت پھول.....؟“

”تم ریچھ کے ساتھ کام کرو گی۔؟“ لیکھک نے بڑے اچنبھے سے پوچھا۔

”لکھنتی مہیں ہوان کے جسم پر کتنے بال ہیں۔؟“  
”میں نے ایسے کئی فلمی ہیرو دیکھے ہیں۔ جن کے جسم پر ریچھ سے بھی زیادہ بال ہوتے ہیں۔!“

”اور ایکٹنگ کرتے وقت منہ کتنا برابرتا ہے ریچھ۔؟“ لیکھک اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔!

”میں نے اس سے بھی زیادہ برا منہ بنانے والے مہیرو دیکھے ہیں۔“ چنچلا بولی۔!

”یہاں تمہاری عزت محفوظ نہیں ہے۔!“

”عزت تو وہاں بھی محفوظ نہیں تھی۔!“

”یہ لوگ جانور ہیں۔!“

”یہ بیچارے تو جانور کے بھیس میں جانور ہیں۔۔۔ میں نے

تو انہوں نے کہیں میں جانور دیکھے ہیں۔ !

”اس جنگل میں رہ کے تمہیں کیا ملے گا۔“

”سات بادشاہوں کا خزانہ۔“ ہیرودین بولی۔

”ناگ بھی مجھ سے عشق کرنے لگتا ہے۔ بولتا ہے۔ میں سارا خزانہ

تمہارے قدموں میں ڈھیس کر دوں گا۔ بس میں اب اس

جنگل میں رہ کر اطمینان سے تصویریں بناؤں گی۔ بس اور مزے

کی بات یہ ہے کہ یہاں نہ انکمٹیکس کا جھگڑا ہے اور نہ بلیک اور

وہائٹ کا لفظا۔۔۔ ہرچیز میں، میں ہی ہیرودین بنوں گی۔

اور روز ہاتھی کی سواری کروں گی۔“ چنچلا خوشی سے تالی بجا کر

بولی۔ !

”میں تم سے پیار کرتا ہوں۔“ لیکھک نے ایک

ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

”تو کرتے رہو۔ اور بھی کرتے ہیں۔ تم بھی کرتے رہو۔

یہاں کس نے منع کیا ہے۔“

لیکھک ایک ٹھنڈی سانس بھر کے چپ ہو گیا۔ اور

راتوں رات جنگل پار کر کے نکل گیا۔ صبح جب آؤٹ ڈور شوٹنگ

کی جگہ پر پہنچا تو خیمے اکھاڑے جا رہے تھے۔ اور فلم کمپنی واپس جا رہی

تھی۔ ڈاکٹر کیسٹرن نے اسے بتایا۔

"ہم نے تمہاری جگہ ایک ایکسٹرا کو لیکھک رکھ

لیا ہے۔ اب تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"

لیکھک بیچارہ پھر جنگل کو واپس بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے

جب شیر کے دربار میں پہنچا تو وہاں بھی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی!

دیجھنے بتایا۔ "اب تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"

بادشاہ سلامت نے خود کہانی لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

مایوس ہو کر لیکھک نے طنزاً کہا۔ "کہانی تو لکھیں گے

مگر لیکھک کا دماغ کہاں سے لائیں گے۔"

اتنا سنتا تھا کہ شیر گرج کر لیکھک پر جھپٹا اور اس کا

دماغ کھا گیا۔ پورے کا پورا لیکھک کھا گیا۔

لیکھک کو کھانے کے بعد شیر نے دھڑا دھڑا ہرٹ

پچسپیں لکھ ڈالیں۔ جانوروں کا منغل اعظم، ڈبل جنگلی، مارن

کی پوتی۔ آدم خور، "انارکلی کے کباب"۔

سنا ہے کہ ان پچسپروں کی کامیابی سے متاثر

ہو کر ہالی ووڈ کی ایک کمپنی نے شیر کو امریکہ آنے کی دعوت

دیسا ہے۔

ہمارا شیر بہت جلد ایم۔ بی۔ ایم کمپنی میں جانے

والا ہے۔







# ناگ منی

پانچویں فلمی حکایت

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ معسر بی گھاٹ کے ایک گھنے  
جنگل میں ڈھاک کے ایک پیڑ کے نیچے ایک آدمی پڑا سوتا تھا۔ جب  
آدھی رات ادھر ہوئی تو اس پیڑ کی شاخ پر اٹوؤں کا ایک جوڑا کہیں  
دور سے اڑتا ہوا آیا۔ اور بیٹھ کر سوتلے لگا۔

نیچے سوتے ہوئے آدمی کو دیکھ کر اٹن نے اٹن سے کہا۔  
"اے بیوی اس پیڑ کے نیچے جو مسافر پڑا سوتا ہے۔ جانتی ہے کون  
ہے یہ۔"

"کون ہے۔" اٹن نے پوچھا۔ پھر نیچے سوئے ہوئے  
مسافر کے پٹے پرانے کپڑے دیکھ کر بولی۔  
"مجھ تو بھاری کوئی بھک منگا یا فقیر لگے ہے۔"

"یہ فقیر نہیں ہے۔" اُلو بولا۔ "اس کا نام کھوٹے لال ہے، کسی زمانے میں یہ شہر بھٹی کا ایک بہت بڑا بزنس مین تھا۔ اس زمانے میں پودے شہر میں اس کا طوطی بولتا تھا۔ آجکل اُلو بولتا ہے۔ یہ اس پُر کے نیچے دیوالیہ ہو کر سو رہا ہے۔ عیج سویرے یہ یہاں سے اٹھ کر گھاٹ کی چوٹی پر جائے گا۔ اور چھلانگ لگا کر خودکشی کرے گا۔"

"ہائے ہائے۔" اُن آخر عورت تھی۔ بُری ہمدردی سے سوئے ہوئے مسافر کو تاکتے ہوئے بولی۔ "مہاراج اس غریب کو کسی طرح سے بچا لیجئے۔"

"نہیں۔" اُلو بُری سختی سے بولا۔ "تو نہیں جانتی نیک بخت یہ آدمی اسی سلوک کا مستحق ہے۔ جن دنوں یہ شہر بھٹی میں بزنس کرتا تھا۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ بات بے بات پر ہر کسی کو اُلو کا پٹھا کہتا تھا۔"

"اُلو کا پٹھا کہتا تھا تو کیا تھا۔۔۔؟ ہم دونوں اُلو ہیں۔ بلکہ آپ تو دنیا کے سب سے بُرے اُلو ہیں۔ اُن بولی۔ "اُلو ہونے میں کیا برائی ہے۔؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو نیک بخت۔ جانوروں کی لستی میں اُلو سب سے عقلمند مانا جاتا ہے۔ لیکن انسانوں کی لستی میں عقلمند اُلو کو سب سے

یہ وقوف سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے انسانوں کی لبتی میں جب کھوٹے  
 لال کسی کو ابو کہتا تھا تو وہ صرف نہ اس انسان کی بے عزتی کرتا تھا بلکہ  
 ہم آؤں کی بھی۔

”بہت بری بات ہے کسی کو گالی دینا۔ چچ چچ.....  
 ان بولی :- ” مگر اس وقت سچا رہ دیکھئے کس حالت میں پراسور ہا  
 ہے۔ غرور اس کی مدد کیجئے، مہاراج۔“

”نہیں میں ہرگز اس کی مدد نہیں کروں گا۔“ آؤ نے تنکھے  
 لہجہ میں کہا۔ ”حالانکہ میں چاہوں تو اس کی مدد کر سکتا ہوں۔“  
 ”وہ کیسے مہاراج۔“

”سنو پیاری۔ اگر یہ آدمی جو اس وقت نیچے پڑا ہے سہ  
 سوتا ہے۔ صبح اٹھ کر پہاڑی کی چوٹی سے کود کر خودکشی کرنے کے بجائے  
 نیچے گھاٹ میں اتر جائے اور سات کو س تک چلتا جائے تو سات کو س  
 کے سفر کے بعد اس کو سات دروازوں والا ایک قبرستان دکھائی  
 دیگا۔ جس کے ہر دروازہ کے باہر ایک مجاور بیٹھا ہوگا۔ یہ مجاور دراصل  
 مجاور نہیں ہیں۔ بلکہ پرانے فلمی لیکھک ہیں۔ جو فلموں میں کام نہ  
 ملنے سے قبرستان کی مجاوری کرنے لگے ہیں۔ یہ سات مجاور اس  
 سے سات سوال کریں گے۔ اور اگر اس مسافر نے جو اس وقت مدہوش

ٹپرا سوتا ہے۔ ان مجاوروں کے ساتھ سوالوں کا ٹھیک جواب  
دید یا تو وہ اسے آگے جانے دیں گے۔ ورنہ وہیں قبرستان میں  
سکاڑ دیں گے۔“

”بائے بے چارہ۔“ اٹن نے ہمدردی سے سر ہلا کے کہا۔  
”اگر یہ ان ساتھ مجاوروں سے بچ گیا اور آگے چلا گیا،  
تو آگے پھر بڑی مصیبت ہوگی۔“  
”کیا ہوگی۔؟“ اٹن نے پوچھا۔

”مثال کے طور پر اگر یہ قبرستان سے دہنی طرف کو  
مڑ گیا تو راستہ میں اسے ایک گہری دل دل ملے گی۔ جہاں  
سات لکڑ مچھ رہتے ہیں۔ وہ اسے کھا جائیں گے۔ لیکن اگر یہ  
مساغروائیں طرف جانے کے بجائے بائیں طرف کو مڑ گیا تو سات میل  
کی دوری پر اسے سات بڑ جیوں والا ایک قلعہ ملے گا۔ پر اقلہ —  
اس قلعے کی ساتویں بڑ جی میں وہ کبھی رکھی ہے۔ جس سے قلعے کا تہہ  
خانہ کھلتا ہے۔“

”تہہ خانہ میں کیا ہے۔؟“  
”شاہی خزانہ ہے۔“ اٹن بولا۔ ”اور اتنا بڑا  
اتنا قیمتی شاہی خزانہ ہے کہ یہ شخص ساری زندگی عیش و آرام سے



رہ سکتا ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ اس خزانے پر ایک ناگ کا قبضہ ہے۔ یہ ناگ پچھلے جنم میں فلم فنا لے کر تھا۔ اور اب اس خزانے پر کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ اور کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا۔ بہت سے لوگ اس شاہی خزانے کی تلاش میں وہاں گئے۔ مگر کوئی زندہ نہیں لوٹا۔ ہاں اگر یہ مسافر کسی طرح وہاں تک پہنچ جائے اور اس ناگ کی خوشنودی حاصل کر لے تو اس کی قیمت بدل سکتی ہے۔ مگر یہ بے وقوف تو پرا سوتا ہے۔ اسے کچھ نہیں ملے گا۔“

اتنا کہہ کر اٹو اپنی الٹ کو لے کر پرواز کر گیا۔ ان کے جانے کے بعد کھوٹے لال نے کروٹ بدلی اور آنکھیں کھول کر اوپر دیکھا۔ دراصل وہ سوتا نہ تھا۔ بلکہ جاگ رہا تھا۔ اس نے اٹو کی سب باتیں سن لی تھیں۔

دوسرے دن پو پھٹتے ہی کھوٹے لال اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس نے خودکشی کا خیال ترک کر دیا۔ اور خزانہ ڈھونڈنے کو چل پڑا۔ سات کوس نیچے گھاٹی میں سفر کرنے کے بعد اسے سات دروازوں والا قبرستان دکھائی دیا۔ جب کھوٹے لال قبرستان کے پہلے دروازے پر پہنچا تو اسے سب سے پہلا مجاور دکھائی دیا۔ اس کی گھنی داڑھی تھی۔ مونچھیں خوفناک تھیں۔ اور آنکھیں لال تھیں۔

وہ مجاور اپنے ہاتھ میں بندوق تانے کھڑا تھا۔  
 "ہالٹ !" پہلے مجاور نے کہا۔ "مرنے کے لئے تیار ہو جا !"   
 "مگر کیوں۔ ؟" کھوٹے لال بولا۔ "میں نے کیا قصور

کیا ہے۔ ؟"

"تیرا قصور یہی ہے کہ تو اِدھر کیوں آ نکلا۔ ؟ کیا تجھ کو  
 معلوم نہیں ہے کہ یہ زندوں کا قبرستان ہے۔ ؟"  
 "زندوں کا۔ ۔ ؟" کھوٹے لال نے بڑی حیرت سے پوچھا۔  
 "ہاں !" یہاں مردے نہیں گاڑے جاتے ہیں۔ بلکہ زندہ  
 لوگ گاڑ دیے جاتے ہیں۔"  
 "کیا میری جان بخشی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ۔ ؟"  
 کھوٹے لال نے پوچھا۔

"ہے۔ ۔" وہ مجاور بولا۔ اگر تو میرے سوال کا ٹھیک  
 جواب دے تو تجھے دوسرے دروازے پر جانے دوں گا۔ ورنہ یہیں  
 زندہ گاڑ دوں گا۔"

"سوال کرو۔ ۔" کھوٹے لال نے کہا۔

"تین سال میں سب سے اچھا منہ قتل کونسا ہوتا ہے۔ ؟ پہلے

مجاور نے سوال کیا۔

"پچیسواں ! " کھوٹے لال نے کہا ۔ " جب فلم کی سلور جلی ہوتی ہے ۔

" شاباش تو آگے جا سکتا ہے ۔ دوسرے دروازے پر آ دوسرے دروازے پر پھر دوسرے مجاور نے روک لیا ۔ اور اسی طرح زندہ گاڑ دینے کی ٹھانی ۔ کھوٹے لال نے جاں بخشی چاہی ۔ مجاور نے سوال کرنا چاہا ۔ کھوٹے لال بولا ۔

" سوال بے شک کرو ۔ مگر دوسرے مجاوروں کو بھی بلاؤ ۔ ہر دروازہ پر موت کی دھمکی دینے سے یہی بہتر ہے کہ تم سب مل کے اکٹھے سوال کرو ۔ اگر جواب تسلی بخش ثابت ہوئے تو مجھے ساتویں دروازے سے گزر جانے دینا ورنہ یہیں گاڑ دینا ۔ "

" بخوبی متغول تھی ۔ دوسرے مجاور نے باقی مجاوروں کو بلالیا ۔ پہلا مجاور تو اپنا سوال کر ہی چکا تھا ۔ اب دوسرے مجاوروں کی باری تھی ۔ اس نے پوچھا ۔

دوسرا مجاور :- اگر تمہارے پاس کہیں سے اسی لاکھ روپیہ آجائے تو تم کو کتنی فلم بناؤ گے ۔ ؟

جواب :- میں فلم بناؤں گا ہی نہیں ۔

تیسرا مجاور :- عموں نے عشق کی تین منزلیں متغور

کی ہیں۔ ان تینوں منزلوں کے نام تباؤ۔ !  
جواب :- پہلی منزل روپیہ — دوسری منزل فلم

— تیسری منزل دیوالیہ۔  
چوتھا محاورہ :- کچھ لوگ عورتوں کو پردے میں رکھنے  
کے حق میں ہیں۔ کچھ لوگ اس کے خلاف ہیں۔ تمہارے خیال میں  
کیا صحیح ہے۔ ؟

جواب :- میں عورتوں کو پردے میں ہر وقت رکھنے  
کے حق میں ہوں۔ بشرطیکہ وہ اسکرین کا پردہ ہو۔  
پانچواں محاورہ :- اگر سیو سیلٹی کے نل میں پانی نہ آئے  
تو کیا کرنا چاہیے۔ ؟

جواب :- ٹھٹھا پینا چاہیے۔  
چھٹا محاورہ :- اگر کسی کو اس دنیا میں چمچہ گیری نہ آتی  
ہو تو وہ کیا کرے۔ ؟

جواب :- وہی کرے جو آپ کر رہے ہیں۔  
یہ جواب سنتے ہی وہ ساتواں محاورہ کوئی سوال کے  
غیر مسافر کے قدموں میں گر گیا۔ ..... اور اب وہ ساتوں  
محاورہ اس کے قدموں میں گر کر گر گڑا گڑا لگے۔ اور اسے اپنے

ساتھ رکھنے پر اصرار کرنے لگے۔ "آج سے تم ہمارے گرد ہو۔ ہم تمہارے  
چیلے۔ ہمارے ساتھ رہو۔ ہم دن رات تمہاری خدمت کریں گے۔"

کھوٹے لال نے ان سے وعدہ کیا۔ "جہاں میں جا رہا  
ہوں وہاں اگر میسر اس کام نہ بنا تو میں یہیں آکر رہ جاؤں گا۔" کھوٹے  
لال نے ان سے وعدہ کیا اور وہاں سے رخصت ہوا۔ اور مگر مچھوں  
والی دل دل سے کتر اکو سیدھا الو کے تباٹے ہوئے راستہ پر پالنے  
قلعہ میں پہنچ گیا۔ اور ساتویں برجی میں رکھی ہوئی کنجی حاصل کر کے  
قلعہ کے تہہ خانہ میں پہنچ گیا۔

تہہ خانے میں جاتے ہی ایک خوفناک پھنکا رسائی دی۔  
کھوٹے لال سہم کر دروازے میں کھڑا رہ گیا۔ سارا تہہ خانہ مردوں کی  
ہڈیوں اور سوکھے پنجروں سے بھرا ہوا تھا۔ دیواروں پر جالے لٹک  
رہے تھے۔ مگر تہہ خانے میں گلابی رنگ کی دھیمی دھیمی روشنی تھی۔  
اور یہ روشنی ناگ کے منہ سے نکلتی تھی۔ یہ "ناگ منی" کی روشنی تھی۔  
ناگ کے منہ میں ایک بہت بڑا لعل رکھا ہوا تھا۔ اس لعل کی روشنی  
سے نور چھن چھن کر تہہ خانے کے در و دیوار کو منور کر رہا تھا۔

کھوٹے لال نے دیکھا ایک کالا کوڑیا سا شب ایک بہت  
بڑے آہنی صندوق پر کندلی مارے چھن اٹھا گئے بیٹھا ہے۔



ناگ نے کہا :- ”خزانے کو ہاتھ لگایا تو مارا جائیگا۔ بہتری  
اسی میں ہے کہ لوٹ جا۔“..... کھوٹے لال بولا۔۔۔۔۔

”مجھے خزانہ نہیں چاہیے۔ میں دنیا تیاگ چکا ہوں۔ میں ناگ و پوتا  
کا پجاری ہوں۔ باقی ساری زندگی تیری سیوا میں گزار دوں گا۔  
“ تو جھوٹ بولتا ہے۔“ ناگ نے کھوٹے لال کو شبہ کی  
نظروں سے دیکھ کر کہا۔

”آزمائے دیکھ لو۔“ کھوٹے لال نے اس سے کہا اور ناگ  
کے سامنے دودھ کا پیالہ رکھ دیا۔۔۔۔۔ ناگ کئی برسوں کا بھوکا تھا۔  
پیالے سے دودھ پیئے لگا۔ دودھ پی کر چاروں طرف کھوٹے لال  
کے چاروں طرف گھوما۔ اس نے کھوٹے لال کے جسم کا ایک ایک  
حصہ دیکھ لیا۔ کھوٹے لال کے پاس چاقو تھا نہ چھری۔ نہ بندق  
نہ رائفل نہ پستول۔ وہ نہتا آیا تھا۔ اور صرف ایک لنگوٹ باندھ  
کر تہہ خلتے میں داخل ہوا تھا۔

جب ناگ کو اچھی طرح دیکھنے بھالنے کے بعد اطمینان ہو گیا  
تو اس نے کھوٹے لال کے جسم کو اچھی طرح سے اپنی کندلی میں کس  
لیا۔ اور اسے مکمل بے بس کر کے سو گیا۔ برسوں سے سویا نہیں تھا۔  
اس لئے کئی دن سوتا رہا۔ چار دن کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی۔



اس نے دیکھا کھوٹے لال اسی طرح کنڈلی میں بیٹھا ہوا آنکھیں بند  
 کئے منہ میں بُدبُدار ہے۔ جسے ناگ دیوتا کی۔ بے ناگ دیوتا کی۔  
 ناگ کھوٹے لال کی عقیدت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس  
 نے عندِ وقت کھول کر ایک چھوٹا سیرانکا لایا اور اسے کھوٹے لال کی  
 طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "جائے جا ہم تجھ سے بہت خوش ہیں۔"  
 کھوٹے لال نے انکار میں سر ہلایا۔ "مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"  
 ناگ دیوتا بس اپنے چرنوں میں جگہ دیدو! میں زندگی بھر تمہاری خدمت  
 کروں گا۔ یہی ایک آس لیکر آیا ہوں۔"  
 "تو جھوٹا بولتا ہے۔" ناگ اسے شہے کی نظروں سے  
 دیکھ کر بولا۔ "تو غلم بنانا چاہتا ہے۔"  
 "غلم۔۔۔ غلم کیا ہوتی ہے تمہارا راج۔؟ کھوٹے لال  
 بڑی مشہوریت سے بولا۔

ناگ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے کھوٹے لال کی  
 راست بانہ کی پرکھ کر کچھ یقین ہو چلا تھا۔ مگر پورا نہیں۔ اس  
 نے کھوٹے لال سے کہا۔ "جا میرے لئے جنگل سے دودھ لیکر آ۔"  
 کھوٹے لال جنگل میں گیا۔ اور ایک جنگلی بکری کو پکڑ کر  
 اس کا دودھ دو کر لایا۔ ناگ نے دودھ پی لیا اور پھر کھوٹے لال کو

اپنی کنڈلی میں کس کے سو گیا ۔

اسی طرح پانچ سال گزر گئے ۔ ہر روز کھوٹے لال جنگل میں جاتا اور دودھ کا پیالہ بھر کے لاتا اور ناگ کی خدمت میں پیش کرتا ۔ اور اس کی کنڈلی میں کسا ہوا دمک کر چپکے سے پڑا دیتا ۔ ناگ نے اس کی آزمائش کرنے کے لئے اسے کئی بار مہیرے اور جواہرات اور موتی دیے چاہے ۔ مگر ہر بار سر ہلا کر کھوٹے لال انکار کرتا رہا اور ناگ کا اعتقاد اس پر دن بدن بڑھتا گیا ۔ اسی طرح پانچ سال گزر گئے ۔ پانچ سالوں کے بعد ایک دن جو کھوٹے لال جنگل میں دودھ لینے گیا تو دیر تک واپس نہیں آیا ۔ ناگ بہت بھوکا تھا ۔ کیونکہ اب اسے ہر روز دودھ پینے کی عادت ہو گئی تھی ۔ مگر کھوٹے لال دن بھر نہیں آیا ۔ اور دن بھر ناگ بھوکا پیاسا بچے دتاب کھا رہا تھا شام کو جب دن ڈھل رہا تھا ۔ کھوٹے لالی خالی پیالہ ہاتھ میں لئے تہہ جلتے میں داخل ہوا ۔ اس کے داخل ہوتے ہی ناگ نے ایک زہریلی بھیکار بھری اور پوچھا ۔

”نالایق ! کہاں تھا اس وقت تک ؟ اور پیالہ

کیوں خالی ہے ۔“

کھوٹے لال ٹٹے دست بستہ عرض کی ۔ ”وہ پیالہ دوسرے

ناگ نے پی لیا۔

”دوسرا ناگ۔ کون دوسرا ناگ۔؟“

”مہاراج۔“ کھوٹے لال کانپتے ہوئے لہجہ میں بولا۔

”میں جنگل سے دودھ لیکر سیدھا آپ کی طرف لوٹ رہا تھا کہ راستہ میں ایک کھٹے دار جھاڑیوں سے بھرے ٹیلے کے اندر سے ایک بہت بُرا خوفناک ناگ نکلا۔۔۔ اس کی پانچ آنکھیں تھیں۔ اور پانچ زبانیں تھیں اور اس کے منہ میں ایک کے بجائے تین لعل تھے۔ آپ کی ناگ منی سے بھی زیادہ روشن اور خوبصورت اور..... ایک کے بجائے تین۔!“

”ہو نہیں سکتا۔ تین لعل والا ناگ ہم نے آج تک نہیں

دیکھا۔“

”میں آپ کو دکھا سکتا ہوں مہاراج۔ وہ بُرا خطرناک

ناگ تھا۔ مگر بندہ بھی آپ کا شاگرد ہے۔ میرے دل ہی دل میں آپ کو یاد کیا اور اس ناگ سے لڑنے لگا۔ اس لڑائی میں

دودھ کا پیالہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور زمین پر بہ گیا۔

ناگ زخمی تو ہوا مگر مرا نہیں۔ وہ ٹیلے کے نیچے بل میں گھس گیا۔ میں بل کے اندر جا نہیں سکتا تھا۔ ناچار لوٹ آیا۔“

”کیا وہ ناگ ابھی تک اسی بل میں ہے۔؟“

”ہاں مہاراج۔“

”اور اس کے تین لعل۔؟“

”اس کے منہ میں ہیں۔“

”چلو ہم کو دکھاؤ۔“ ناگ کے دل میں لالچ پیدا ہوا۔

”اگر تو سچ بولتا ہے۔۔۔ اگر ناگ زخمی ہے۔ اگر اس کے منہ میں

ایک بجائے تین لعل ہیں، تو ہم وہ تینوں لعل حاصل کر لیں گے۔

اور تم کو اپنے خزانے میں سے پانچ فیصدی حصہ دیں گے۔“

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔۔۔“ کھوٹے لال ہنستا ہوا بولا۔

”بس میں تو آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔“

خزانے کا ناگ کھوٹے لال کے ساتھ روانہ ہوا۔ کھوٹے

لال پر بیچ راستوں سے گذرتا ہوا ناگ کو ایک اونچے ٹیلے کے قریب

لے گیا۔ اور ایک بل کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

دیکھ لیجئے حضور! وہ ناگ اسی بل میں گھسا بیٹھا ہے۔

ناگ نے جب بل کے اندر جھانک کے دیکھا تو اسے

بل کی تاریکی میں تین لعل روشن اور منور، دور سے چمکتے ہوئے نظر

آئے۔ ناگ نہ ہلایا نہ ہنکرایا، بھرتا ہوا فوراً بل کے اندر گھوس گیا۔ دور

تنگ اندر جانے کے بعد جو نہی اس نے لعل کو کپڑے کے لئے منہ اٹھایا۔  
وہ دیر سے بلبلا کر ترپنے لگا۔

یہ لعل نہیں تھے۔ آگ کے دیکھتے ہوئے انگارے تھے کھوٹے لال  
نے موقع پا کر ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے تحت اس نقلی بل کو اندر سے  
دیکھتے ہوئے انگاروں سے بھر دیا تھا۔ جو نہی ناگ نے انگاروں کو منہ میں  
اٹھانا چاہا۔ اس کی زبان جلنے لگی اور وہ درد کی شدت سے ترپنے لگا۔  
”ارے یہ لعل نہیں ہیں۔ انگارے ہیں۔“ ناگ نے تڑپتے  
ہوئے کہا۔

”انگارے ہیں۔“ کھوٹے لال نے حیرت سے پوچھا۔  
”ہاں مجھے بچاؤ۔ میرے منہ سے انگارے نکال لو۔ میں  
جل رہا ہوں۔“

”کیسے نکالوں مہاراج۔ آپ کے منہ میں تو زہر کے دانت  
ہیں۔ ہاں اگر آپ منہ اچھی طرح سے کھولیں تو شاید میں کچھ آپ کی مدد  
کر سکوں۔“

ناگ نے اپنا منہ اچھی طرح سے کھول دیا۔ فوراً اسی وقت  
کھوٹے لال نے سسپہ خارشیت کے چار بڑے بڑے کانٹوں سے ناگ  
کا منہ اس طرح کھول دیا کہ اب وہ کسی طرح اس منہ کو بند نہیں کر سکتا تھا۔



اس کے بعد اس نے سانپ کے منہ میں ہاتھ ڈال کر سب سے پہلے "ناگ منی" اپنے قبضے میں کی۔ پھر جب وہ بل کے سوراخ کو مٹی اور پتھروں سے اچھی طرح بند کرنے لگا۔ تو ناگ نے چلا کر کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟" "اب تمہارا خزانہ لینے جا رہا ہوں۔" کھوٹے لال نے ہنس کر کہا۔

ناگ کو اب کھوٹے لال کی چالاکی سمجھ میں آئی۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا منہ سیہ کے کانٹوں سے چھدا ہوا کھلے کا کھلا تھا۔ اب وہ کسی طرح سے اپنے منہ کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ نہ اپنے زہریلے دانت استعمال کر سکتا تھا۔ نہ فی الحال بل سے باہر نکل سکتا تھا۔

"تم کون ہو۔؟" ناگ نے کھوٹے لال سے پوچھا۔ "میں بس اتنا جانتا چاہتا ہوں کہ جس آدمی نے ایک سانپ کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس کی ناگ منی نکال لی ہے۔ وہ آدمی کون ہے۔؟" کھوٹے لال نے بل کے سوراخ پر آخری پتھر رکھتے ہوئے کہا۔ "مہاراج میں ایک فلم پر وڈیو سر ہوں۔"

ختم شد